ربیع الثانی۔ جمادی الاُخریٰ ۱۴۳۹ھ

جنوری۔ مارچ ۲۰۱۸ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۷ شمارہ ۱

ربیع الثّانی۔ جُمادی الأُخریٰ ۱۴۳۹ھ جنوری۔ مارچ ۲۰۱۸ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہما

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ مؤمن محمود
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501
ویب سائٹ : www.tanzeem.org
ای میل: publications@tanzeem.org
سالانہ زرِتعاون: 240 روپے، فی شمارہ: 60 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

ازکجا تا بہ کجا.....؟	حافظ عاطف وحید	3

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۱۲)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	16

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	29

قرآنیات

کتابت مصاحف اور علم الرسم	پروفیسر حافظ احمد یارؒ	37

حُسنِ مُعاشرت

اسلام میں عورت کا مقام اور میاں بیوی کے باہمی معاملات (۴)	پروفیسر حافظ قاسم رضوان	55

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	ادارہ	72

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

از کجا تا سہ کجا.....؟

حافظ عاطف وحید

ابھی حال ہی میں دنیائے خبر کے سب سے موٴقر ماٴخذ یعنی ''بی بی سی'' کی اردو ویب سائیٹ پر ایک خبر نظر سے گزری۔ عنوان ہے ''سوات: ڈی ریڈیکلائیزیشن''۔ ماہِ رواں کی ۵ تاریخ کی اس خبر کے عنوان سے ہی عیاں ہے کہ یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صوبہ KPK کی اس خوبصورت وادی میں بسنے والے مرد و خواتین کے پختہ دینی تشخّص اور جذبات کو جدید رجحانات کے عین مطابق بے اثر (neutralize) کرنے کی سرکاری کوششوں کی مختصر رپورٹ پر مشتمل ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ وادیٔ سوات میں ۲۰۰۹ء میں ہونے والے آپریشن کے بعد چار ایسے بحالی مراکز قائم کیے گئے تھے جہاں طالبان کے اُن ساتھیوں کی تربیت کی جاتی تھی جنہوں نے ہتھیار ڈالے اور ان کے خلاف کوئی بھی جرم ثابت نہ ہو سکا تھا۔ اس رپورٹ میں اس بات کا ذکر بھی ہے کہ اب تک تقریباً تین ہزار افراد ڈی ریڈیکلائیزیشن یعنی انتہا پسندانہ سوچ کے خاتمے کے ان تربیتی مراکز سے فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ معاملہ ''بین الاقوامی'' اہمیت کا ہے شاید اسی لیے اس کا بروز عالمی سطح کے خبرنامے میں ہوا۔ مقامی صحافت نے شاید کسی مصلحت سے اس خبر کو اہمیت نہیں دی۔ اور اس تمام کارگزاری کے لیے انتہا پسندی بلکہ شدت پسندی کا ''عفریت'' بطور حوالہ مذکور و مفروض ہے۔

ہمیں اس خبر کی صداقت سے بحث نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس علاقے کے لوگوں کی روایتی دینی وابستگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ نئی تہذیب کے گندے انڈوں کے خبیث اثرات سے اس علاقے کے باشندوں میں محفوظ رہنے کا عزم اکیسویں صدی میں بھی کمزور نہ ہو سکا تھا۔ شرم و حیا' عفت و عصمت' ستر و حجاب اور شرعی حدود و تعزیر سے دستبرداری پر یہ لوگ تادمِ آپریشن کسی صورت تیار نہیں تھے۔ لہٰذا ان کا علاج یہی تھا کہ انہیں ''بحالیٔ معذوراں'' کے مراکز میں تاحصولِ مقصد زیرِ علاج رکھا جائے اور اس خوبصورت سیاحتی مرکز کو جدید عالمی سیاحت کی جملہ رعنائیوں کے لیے محفوظ و مامون بنا دیا جائے' اور اس پائلٹ پراجیکٹ کو باقی علاقوں کی بچی کھچی ڈی ریڈیکلائیزیشن کے لیے بطور تجربہ گاہ استعمال کیا جائے۔ اس کے سوا اِس تمام اکھاڑ پچھاڑ کا کوئی دوسرا بامعنی ہدف تھا تو اسے سامنے لایا جانا چاہیے تاکہ بے خبر لوگوں کی لاعلمی کو دور کیا جا سکے۔

پاکستان وہ منفرد ملک ہے جسے اس اعلانیہ خواہش پر قائم کیا گیا تھا کہ یہاں اسلام کے اصولِ حریت' اخوت اور مساوات کا ایک اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے گا۔ اس کے وجہ جواز کے طور پر اس خطے کے

باشندوں کو یہ باور کروایا گیا تھا کہ نہ کوئی نسلی قوم پرستی کا جذبہ ہے اور نہ ہی لسانی —— حتیٰ کہ وطنی قومیت بھی مسلمانوں کے سامنے ہدفِ اعلیٰ نہیں ہے —— اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے! چنانچہ ''دوقومی نظریہ'' وہ اساس ہے جس پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ ظاہری اور واقعی بات ہے کہ جس نظریے کی بنیاد پر یہ وجود میں آیا ہے اسی پر اس کے قیام' بقاء اور استحکام کا مدار ہوسکتا ہے۔ اس نظریے سے پسپائی اور دستبرداری میں جو قیامت مضمر ہے اس کے لیے دلائل لانے کی ضرورت نہیں!

محسوس ہوتا ہے کہ ڈی ریڈیکلائیزیشن کے ایجنڈے کے صورت گروں اور معماروں کو دوقومی نظریے کی حقیقت اور اس کے تقاضوں سے مخاصمانہ سابقہ ہے' لیکن بوجوہ وہ یہ بات واضح طور پر کہہ بھی نہیں سکتے کہ اکیسویں صدی میں دنیا کے شانہ بشانہ چلنے کے لیے اس نظریے سے دستبردار ہوجانا چاہیے —— چنانچہ بظاہر اس کا طریق یہی موزوں نظر آیا کہ اوّلاً انتہا پسندی کے جذبات کی مہمیز کے احوال پیدا ہوں اور بعد ازاں ان کی سرکوبی کے ظروف فراہم کیے جائیں۔ ریاستی اداروں کی سرپرستی میں ایسے طریقہ کار کو بروئے کار لانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بیشتر غیر معمولی اہداف اسی طور سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ ہمیں اس سے پریشانی نہیں ہے' ہمارے پیش نظر وہ مہلک اہداف ہیں جنہیں اب غیر محسوس انداز میں pursue کیا جارہا ہے۔

پاکستان کیوں وجود میں آیا؟ اس کے تاریخی' جغرافیائی' معاشرتی اور مذہبی پس منظر' اسباب اور وجوہِ اسباب کیا تھے؟ تحریک پاکستان کے بیشتر حقائق یادداشتوں سے محو ہیں' لیکن بعض دستاویزات ایسی ہیں جن سے فراموش کردہ ماضی اور کھوئی ہوئی منزل کا کچھ پتا لگایا جاسکتا ہے۔ ایسی ہی ایک دستاویز نذرِ قارئین ہے۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جو بعض اچھے اور مفید کام ہوئے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ قائداعظم نے خصوصی دلچسپی لیتے ہوئے ایک آسٹرین نژاد اور جرمن زبان بولنے والے نومسلم صحافی' سیاح' سکالر اور مصنف علامہ محمد اسد (Leopold Weiss, 1900-1992) کو پاکستان آنے کی دعوت دی اور انہیں سب سے پہلا پاکستانی پاسپورٹ جاری کرکے علامہ اقبالؒ کے اس مصرعے کو عملی صورت عطا کی کہ 'اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے!' مزید برآں ایک خاص محکمہ قائم کیا گیا جسے Department of Islamic Reconstruction کا نام دیا گیا اور علامہ محمد اسد کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ علامہ محمد اسد قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کی Foreign Ministry میں بطور ڈپٹی سیکریٹری بھی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

اس نوزائیدہ مملکت خداداد پاکستان کو جن بنیادوں پر مستحکم کرنا پیش نظر تھا اور جن اصولوں اور رجحانات کی آبیاری وقت کی سب سے اہم ضرورت تھی' ان کا خاکہ تیار کرنا اور حکمت عملی وضع کرنا اس محکمے کا بنیادی ہدف تھا۔ چنانچہ اغراض ومقاصد میں مذکور یہ جملہ قابلِ توجہ ہے:

"The ultimate aim of this Department is, to help our community to reconstruct its life on Islamic lines, and therefore it has been named Department of Islamic Reconstruction."

یعنی معاشرے کی اسلامی خطوط پر تعمیرِ نو کے لیے یہ محکمہ قائم کیا گیا۔ قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ اس دستاویز میں وہی تجاویز پیش کی گئی ہیں جو آج کی اصطلاح میں radical قرار دی جاتی ہیں —— نظامِ تعلیم کی اصلاح، قرآن و حدیث کو شاملِ نصاب کرنا، سنتِ رسول ﷺ، اسلامی فقہ کی تعلیم اور سوشل سائنسز وغیرہ میں اسلامی تعلیمات کو اُجاگر کرنا، اسلامی قانون کی روشنی میں معاشرتی اور اقتصادی تنظیم نو اور اس جیسے دوسرے اقدامات تجویز کیے گئے۔ اگر اسلامی تعمیرِ نو کے اس سرکاری محکمے کو کام کرنے دیا جاتا اور اس کی تجاویز پر خلوصِ دل کے ساتھ عمل کیا جاتا تو بعید نہیں تھا کہ ہم اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا ایک اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے واقعی پیش کرنے کے قابل ہوتے۔ لیکن —— آج حالت یہ ہے کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ ڈی ریڈیکلائیزیشن کا ایجنڈا اُسی وقت متحرک ہوگیا۔ علامہ اسد اور اُن جیسے دیگر مخلصین امت کو بے اثر کرنے اور پاکستان کو لادین سیکولر ملک بنانے کا اَعدائے دین اور اَعدائے پاکستان کا منصوبہ پوری قوت کے ساتھ نافذ العمل ہوا۔ تعلیم میں الحاد، معاشرت میں اباحیت اور معیشت میں سودی سرمایہ داری کا تسلسل قائم رہا۔ البتہ بعض علاقوں کے 'بندۂ صحرائی اور مردِ کوہستانی' فطرت کے اُن مقاصد کی نگہبانی میں ڈٹے رہے جن کی آبیاری کے لیے پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اور جستہ جستہ —— بعض نیم دلانہ لیکن قابلِ تعریف اقدامات بھی بے شک کیے جاتے رہے۔ قراردادِ مقاصد کا پاس ہونا، اسلامی نظریاتی کونسل اور فیڈرل شریعت کورٹ کا قیام وغیرہ، جن کا حوالہ اسلامی تشخّص کے اقرار اور اظہار کا ذریعہ تو ہے، لیکن بے اثر اتنا کہ آئین میں قراردادِ مقاصد بھی ہے اور غیر اسلامی دفعات بھی۔ ایسی علمی رپورٹوں کا انبار ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے اربوں روپیہ خرچ کر کے تیار کی ہیں لیکن کوئی واضح ٹھوس لائحہ عمل نہیں ہے جس سے ان کے نفاذ کی عملی شکل وجود میں آئے۔ اور فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے اس سے زیادہ اندوہناک معاملہ اسلامی شریعت کے ساتھ اور کیا ہوگا —— ایک ربا کا کیس ہی اس کی جگ ہنسائی کے ثبوت کے طور پر کافی ہے ع

صلاحِ کار کجا ومن خراب کجا
ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

یہ بات برسرِ موقع ہے کہ Department of Islamic Reconstruction کے تحت علامہ محمد اسد کی تیار کردہ اس دستاویز کو ہر باشعور شخص بغور پڑھے۔ اس لیے اس کا اردو ترجمہ ذیل میں نذرِ قارئین ہے —— تاکہ ''از کجا تا بہ کجا؟'' کا اندازہ قارئین خود کر سکیں:

''ہمارے ملک میں اس وقت مسلمانوں کو مادیت اور روحانیت کے حوالے سے جن تبدیلیوں کا سامنا ہے، ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل حل کرنے کے لیے حکومت نے ایک نیا محکمہ قائم کیا ہے۔ یہ محکمہ، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ایسی رہنمائی فراہم کرے گا جس کی بنا پر ہمارے معاشرے کی تشکیل اسلامی خطوط پر ہو سکے۔ عصرِ حاضر میں یہ پہلی مثال ہے کہ ہمارے ہاں کسی سرکاری محکمے کو قائم کرتے وقت

اس کے نام سے پہلے لفظ ''اسلامی'' لگایا گیا ہو —— اور یہ تمام سابقہ روایات سے ہٹ کر ہوا ہے' لہٰذا مناسب ہوگا کہ کام شروع کرنے سے پہلے عوام کے سامنے چند امور کی وضاحت کر دی جائے۔

پچھلے چند ماہ کے دوران پاکستانی قوم پر بہت کچھ گزر گیا ہے۔ وہ شدید خطرات میں گھری رہی۔ جان و مال کا اس قدر نقصان ہوا کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ لاکھوں مہاجرین کی نقل مکانی ہوئی۔ ایسے مصائب اور تکالیف کا سامنا رہا جن کا پورے طور سے اظہار لفظوں کے ذریعے ممکن ہی نہیں۔ یہ سب کچھ آزادی ملتے ہی ہمارا نصیب ٹھہرا' بلکہ شاید اس سے بھی پہلے۔ ان سب کے باوجود بھی ابھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا مشکل وقت ختم ہو گیا ہے۔ اگرچہ پاکستان آج ایک زندۂ جاوید حقیقت ہے' تاہم ہماری جدوجہد جاری رہنی چاہیے تاکہ ان خطرات کا مقابلہ کیا جا سکے جو چاروں طرف سے ہمارا محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور بقول قائداعظم ''اپنے نظریات کے مطابق ایک ریاست'' کی تشکیل ممکن ہو سکے' یعنی ایک ایسا ملک جہاں ہماری یہ آرزو بَر آئے کہ طرزِ حکومت اسلامی اصولوں اور بنیادوں پر قائم ہو۔ بحیثیت قوم' ہم اس جانب سفر کا باقاعدہ آغاز کر چکے ہیں' لیکن یہ راستہ بہت طویل اور کٹھن ہے۔ ہمارے اُن بھائیوں کو جو اس حوالے سے ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہیں' یہ ادراک ہونا چاہیے کہ اس خواب کی تعبیر آسان نہیں۔ ایک طویل عرصے کی غلامی نے' جس دوران ذلت و مسکنت ہمارا مقدر ٹھہری' ہماری اجتماعی قوت کو زائل کر دیا ہے' جبکہ ہمارے معاشرتی رویے اپنا وجود تک کھو چکے ہیں۔ ایسے میں حقیقی معنوں میں ایک اسلامی نظامِ سیاست کا قیام سہل نہیں۔ اس صورت حال کے باوجود ہمیں یہ مہم سَر کرنا ہوگی تاکہ ہم اپنے دعوؤں کو سچا ثابت کر سکیں۔

یہ حقیقت سب پر آشکار ہے کہ تحریک پاکستان کی بنیاد ایک نظریے پر رکھی گئی تھی۔ ہمارا نقطہ نظر ہمیشہ سے یہ رہا' اور اب بھی یہی ہے' کہ اسلام سے وابستگی کی بنا پر مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ہمارے نزدیک مذہب محض ذاتی عقائد اور اخلاقیات ہی کی ترتیب کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا ضابطہ ہے جو عملی طور پر تمام رویوں کا احاطہ کرتا ہے۔ دوسرے مذاہب کے برعکس' یہ صرف روح یا باطن کی بالیدگی تک محدود ہونے کے بجائے انسانی زندگی کے تمام مادی گوشوں کو بھی اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ قرآن حکیم کے احکام اور سنتِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی روشنی میں ہمارے لیے جو نظام تجویز کیا گیا ہے' اس میں اخلاقی اور طبیعی' روحانی اور عقلی' انفرادی اور اجتماعی الغرض حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں کے حوالے سے قابلِ عمل ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ ایک حقیقی مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کے لیے صرف اسلامی عقائد پر ایمان لانا ہی کافی نہیں ہے۔ ہمیں اس سوچ سے بہت آگے جانا ہوگا۔ اگر اسلام ہمارے لیے محض ایک نعرہ نہیں ہے تو ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے خارجی رویوں کو بھی ان اعتقادات سے ہم آہنگ کرنا ہوگا جن پر ہم یقین رکھتے ہیں۔

اسلام کا یہ امتیازی وصف ہر اُس شخص کے علم میں ہے جو اس مذہب کے اصولوں سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہو۔ درحقیقت اسلام کی اسی تخصیص کو بنیاد بنا کر ہم نے اپنے لیے ایک علیحدہ ملک کا مطالبہ

کیا تھا' کیونکہ اسلامی ضابطہ حیات کو نافذ کرنے کے لیے ایک ایسا خودمختار ریاستی ڈھانچہ لازم کی حیثیت رکھتا ہے جو سیاسی' قانونی اور معاشرتی حوالے سے فیصلے کرنے کی اہلیت اور طاقت رکھتا ہو۔ اسی نظریے کے تحت ہم نے ایک آزاد پاکستان کے حصول کی خاطر جدوجہد کی اور ایسی ایسی مشکلات کا سامنا کیا' اور اب بھی کر رہے ہیں' جو عہدِ حاضر میں شاید ہی کسی اور قوم نے برداشت کی ہوں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری تکالیف اسی لیے زیادہ ہیں کیونکہ ہمارے مقاصد بلند ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک ایسے دور میں جہاں قومیت کا تصور نسل یا تمدّن سے وابستہ ہو' ایک نظریاتی ریاست کا خیال ہی نہ صرف منفرد ہے بلکہ اس سوچ سے متصادم بھی جسے اقوامِ عالم ''پسندیدہ'' اور ''عصری تقاضوں کی حامل'' قرار دیتی ہیں۔ ایسے میں یہ امر یقینی تھا کہ ہماری شدید مزاحمت کی جاتی۔ آج دنیا کے اکثر ممالک میں یہی طرزِ فکر رائج ہے کہ صرف نسلی وحدت اور مشترکہ تاریخی روایات ہی کی بنیاد پر کسی قومی نظریے کو جواز فراہم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف' ہمارے نزدیک ایک نظریاتی ریاست ہی قومیت کی وہ اعلیٰ ترین شکل ہے جو بنی نوع انسان کا مطمحِ نظر ہو سکتی ہے' یعنی انسانوں کا ایک ایسا گروہ جس کی سوچ زندگی کی حقیقت کے بارے میں واضح ہو' اور جو صحیح اور غلط کے بارے میں ایک ہی نقطہ نظر رکھتا ہو۔ ہمارے اس دعویٰ کی بنیاد محض ہمارا یہ ایمان نہیں کہ یہ مخصوص نظریہ یعنی اسلام خود اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے بلکہ ہمارا عقلی شعور بھی اسی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ایک ہم خیال معاشرہ ہی انسانی نظم کی ترقی یافتہ صورت ہے بجائے اس کے کہ ایسا سماج جو اتفاقی طور پر کسی خاص نسل' زبان یا خطہ زمین سے وابستگی کی بنا پر وجود میں آئے۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے' موجودہ دور میں اس موقف کو کم ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ آج بھی دوسرے ممالک میں بسنے والوں کی اکثریت انہی دقیانوسی' قوم پرستانہ خیالات اور تعصّبات کی اسیر ہے جنہوں نے گزشتہ صدیوں میں بتدریج سر اٹھایا ہے' اور یہی اس عہد کے انتشار کا باعث بھی ہیں۔ بحیثیت مسلمان' ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم اس فساد کا حصہ بنیں' لہٰذا اسلام کی ابدی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ہم نے ایک نظریاتی ریاست قائم کرنے کی آزمائش سے گزرنے کا عزم کیا ہے۔

ہم ایک ایسے کشادہ دل معاشرے کی تشکیل کے خواہاں ہیں جس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کا تعاون بھی ہمیں حاصل ہو' تاکہ مروّجہ اور تسلیم شدہ معیارات کے بجائے کسی نظریے کی بنیاد پر ایک ریاست کے قیام کے فیصلے کو پرکھا جا سکے۔ یہ معاملہ نہایت اہم ہے' اور اس ملک کے غیر مسلم شہریوں سے میری گزارش ہے کہ وہ اس پر خصوصی توجہ دیں۔ ہمارا معاشرہ ان معنوں میں آزاد اور غیر مقید ہے کہ یہاں افراد کے باہمی تعاون اور حقوقِ شہریت سے حاصل شدہ فوائد صرف مسلمان طبقے ہی تک محدود نہیں کیے گئے ہیں۔ پاکستان کا آئین مرتب کرنے کے لیے عنقریب دستور ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوگا۔ ہم ہر اس شہری کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہیں' چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم' جو اس آئین کے مطابق اپنا کردار ادا کرے گا۔ یہ ریاست اپنے شہریوں سے صرف اس امر کی طالب ہے کہ قول ہی سے نہیں بلکہ عملی طور پر بھی ہر صورت آئین کی پابندی کی جائے۔ کسی بھی شہری کے معزز ہونے کی واحد کسوٹی آئین سے اس کی وفاداری

ہی ہوگی' چاہے یہ طرزِ عمل کسی دینی اعتقاد سے برآمد ہو یا پھر ایک ایسے عمرانی تصور کو قابل عمل تسلیم کرنے کا ثمر جس پر اس ملک کی اکثریت نے اتفاق کیا ہو۔

دراصل آئین کی تیاری میں زیادہ کردار مسلمانوں ہی کو ادا کرنا ہوگا' کیونکہ ایک تو اس ملک کی اکثریت انہی پر مشتمل ہے' اور دوسرے وہی اس نظریے کے علم بردار بھی ہیں جس کے لیے پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا۔ آیا ہمارے ملک کا آئین ایک معیاری دستاویز کی صورت اختیار کرتا ہے یا نہیں' اصولی طور پر اس کی ذمہ داری صرف دستور ساز اسمبلی کے ارکان ہی پر نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں پر عاید ہوگی! اس سے بڑی غلط فہمی کوئی نہیں ہوسکتی اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ایک مثالی آئین کو کامیابی سے تشکیل دینا صرف انہی چند افراد کا کام ہے جن کو اس مقصد کے لیے قانون ساز اسمبلی نے منتخب کیا ہے۔ ایسی سوچ ہوا میں گرہ لگانے کے مترادف ہوگی۔ اگرچہ ہمارے یہی نمائندے دستور کے خدوخال اور اس کے جزئیات وضع کرنے کے مکلّف ہیں' لیکن اس ضمن میں ان کی محنت صرف اسی صورت ٹھکانے لگے گی جب پورا ملک ہم آواز ہو کر ان کا پشت پناہ ہوگا۔ اس قوم کو صحیح معنوں میں ملت اسلامیہ بننے کے لیے جس حقیقی اتحاد اور نصب العین کی یک رُخی درکار ہے' وہ صرف اس وقت حاصل ہوسکتی ہے جب ہم اپنی ان کمزوریوں اور خامیوں پر قابو پالیں جو گزشتہ چند ماہ کے دوران ہمارے معاشرے میں دَر آئی ہیں' جیسے کہ رسوا کن ذہنی پراگندگی اور پست حوصلگی' یقین اور سماجی وحدت کا زیاں' کردار میں صحیح اور غلط کے اصولوں سے انحراف۔ درحقیقت محکمہ برائے اسلامی تشکیل جدید فکری حوالے سے انہی نامناسب رویوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کرے گا!

اس محکمے کی سربراہی کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے' اور اسی حیثیت سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس ادارے کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی بھی طرح دستور ساز اسمبلی کی کارروائی کو متاثر کرے۔ ہمارے ذمہ جو کام لگایا گیا ہے' یعنی قواعد وضوابط کی رُو سے ہم جس امر کے پابند ہیں' اس کے دو پہلو ہیں۔ اول' عوام کو ایسی رہنمائی فراہم کی جائے کہ وہ اپنے روحانی اور عقلی وسائل سے مربوط انداز میں استفادہ کرسکیں۔ دوم' قوم کے اخلاقی معیار کو دوبارہ اس بلند سطح پر لے جایا جائے جس کی صلاحیت خود کو ملت اسلامیہ کہلانے کے باعث اس میں موجود ہے۔ اسی بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی فضا قائم کرنے میں معاون ہونا جو کہ اسلام کے عملی نفاذ کے نہایت ضروری ہے!

ذیل میں ان اقدامات کے اہم نکات بیان کیے جارہے ہیں جن پر محکمہ برائے اسلامی تشکیل جدید عمل کرے گا۔ یہ امر پیش امر رہے کہ ان اقدامات کو کسی طور بھی حتمی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ صدیوں کے انحطاط کے بعد اسلامی فکر وعمل کا احیا کوئی آسان کام نہیں۔ ایسی عظیم ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے علم و دانش اور فہم وذکا کے حوالے سے ملک کے بہترین اشخاص کو شریک کار کرنا ہوگا تاکہ ایک قطعی لائحہ عمل اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ترتیب دیا جاسکے۔ لہٰذا اس ادارے کی ذمہ داریوں کا تعین تبھی ہوسکے گا جب اسے اس طور منظّم کیا جائے کہ یہ قوم کی راہِ عمل طے کرنے میں معاون ہو' اور رائے عامہ کے معتبر حلقوں سے

اس کا تعلق قائم ہو چکا ہو۔ اس لیے ذیل میں دیے گئے خاکے کا مقصد صرف ان حدود کی نشان دہی ہے جن میں رہتے ہوئے ہمیں اسلام کی تشکیل جدید کا مسئلہ حل کرنا ہے!

قابلِ فہم بنانے کی خاطر' ان اقدامات کو چند ذیلی عنوانات کے تحت بیان کیا جا رہا ہے۔ تاہم عملی طور پر ان میں سے متعدد ایسے امور جن کا ذکر علیحدہ سے کیا گیا ہے' درحقیقت باہم مربوط ہیں۔ یوں یہ کام ایک ہی باقاعدہ نظام کے تحت مکمل کرنے کی ضرورت اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

i) تعلیم

یہ کہا جا سکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی اس ملک کے مسلمان طبقے کو تعلیم کے ایک ایسے مرحلے سے دوبارہ گزارنا ضروری ہے جس میں دینی تقاضوں کو مدنظر رکھا گیا ہو' خصوصاً ان مسلمان نوجوانوں کو جو اس وقت سکولوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ اس کے لیے محکمہ برائے اسلامی تشکیل جدید کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ گاہ بگاہ شعبہ تعلیم کے مقتدر افراد کو ایسی آراء اور تجاویز پیش کرے جن پر عمل پیرا ہو کر ہمارے تعلیمی ادارے اس نئے طرزِ حیات کا نمونہ نظر آئیں جسے اختیار کرنے کا اس قوم نے عزم کیا ہے۔ ان مشوروں کا تعلق نصاب کے بعض پہلوؤں' درسی کتب اور تعلیم سے جڑے امور سے ہوگا۔ اس حوالے سے بھی رہنمائی کی جائے گی کہ تعلیمی اداروں میں عمومی دینی رویے کس انداز سے قائم کیے جائیں۔ مسلمان طلبہ کے لیے دینیات کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت دینی ہوگی۔ اس کا اول و آخر قرآن مجید اور احادیث نبویہ کا ایک ترتیب کے ساتھ مطالعہ ہوگا۔ تعلیم کی ثانوی سطح پر قرآن و حدیث کی اصولیات اور تشریح کی تدریس ہو' تاکہ طلبہ ترجمہ قرآن اور نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ سے آگاہ ہو سکیں۔ کورس کی تکمیلی سطح پر طلبہ کو ان ذرائع کے بارے میں بتایا جائے جنہیں اختیار کر کے اسلامی فقہ کے مختلف مکاتبِ فکر نے قرآن و حدیث کا رسوخ حاصل کیا۔ اس کے لیے دینی تعلیم کے نصاب میں قرونِ اولیٰ کی تاریخ کا ایک تنقیدی اور مفصل جائزہ شامل کرنا ہوگا' جو اس مواد سے بالکل الگ ہو جسے عام طور پر تاریخ کے مضمون میں پڑھایا جاتا ہے۔ اسی طرح دینیات کے تحت فلسفہ اسلامی کی مختلف شاخوں کی تعلیم دی جائے' جس کا فلسفے کی عمومی تدریس سے بالکل کوئی تعلق نہ ہو۔ اس نئے نصاب کے آخری مراحل میں معاشیات اور سوشل سائنسز کے شعبوں میں عہدِ حاضر کے حوالے سے پیش آنے والی مشکلات کا تجزیاتی مطالعہ اسلامی نقطہ نظر سے کرایا جائے۔

یہ سب کچھ کرنے کے لیے رفتہ رفتہ ان مقاصد میں تبدیلی ناگزیر ہوگی جو ہم تعلیم کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں' تاکہ درس و تدریس کے پورے شعبے کا مزاج اسلام سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس امر میں دو آراء نہیں ہو سکتیں کہ ایسا تغیّر و تبدّل فی الفور نہیں ہو سکتا۔ مسائل اتنے زیادہ اور دُوررس ہیں کہ ان پر غور و فکر کے لیے مناسب وقت پر علماء کی متعدد کمیٹیاں تشکیل دی جائیں گی' جن کی سفارشات حکومتی اداروں کو ارسال ہوں گی۔ کمیٹیوں کی رپورٹس موصول ہونے پر انہیں شائع کر دیا جائے گا۔

ہم یہ ارادہ بھی رکھتے ہیں کہ ایک ایسی کمیٹی بنائی جائے جس میں تعلیم کے معروف ماہرین بھی شامل

ہوں اور علومِ شرقیہ کے مستند و معتبر نام بھی۔ ان کے ذمہ درج ذیل امور لگائے جائیں گے:

ا) یہ فیصلہ کرنا کہ آیا سکولوں اور کالجوں میں عربی کو لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے!

ب) اگر اول الذکر کا جواب اثبات میں ہو تو اس پر عمل درآمد کا طریقہ کار کیا ہو!

نصاب سے متعلقہ امور کے علاوہ محکمہ برائے اسلامی تشکیل جدید اس حوالے سے بھی واضح تجاویز دے گا کہ ہمارے سکولوں کے اندرونی ماحول کو اسلامی عقائد و نظریات سے کیسے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے!

ii) اسلامی قانون اور معاشرتی تنظیمِ نو

اسلام کی تشکیل جدید کے لیے ایک واضح اور عملی لائحہ عمل مرتب کرنے میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ سماجی معاملات سے متعلق شرعی قوانین کے حوالے سے ایک یکساں ضابطہ موجود نہیں ہے۔ یعنی ملت اسلامیہ میں اس ضمن میں نہایت افسوس ناک ابہام پایا جاتا ہے کہ تمام سماجی اقتصادی (socio-economic) منصوبوں اور تجاویز میں، جو مختلف حلقوں میں زیر بحث ہیں، کون سی بات اسلامی ہے اور کون سی غیر اسلامی۔ اس سلسلے میں مختلف مسالک میں، خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، پائے جانے والے تضادات کا بنیادی سبب قرآن وسنت کی تعبیر تک پہنچنے کے مختلف طریقے ہیں۔ جب تک ان اختلافات میں ہم آہنگی پیدا نہیں کی جاتی، اسلامی اقدامات کا ایک ایسا خاکہ تیار کرنا ناممکن ہے جو تمام موجودہ مسالک یا ان کی اکثریت کے لیے قابل قبول ہو۔ اسلامی فقہ میں گزشتہ صدیوں کے دوران میں جو الجھاؤ اور تفاوت پیدا ہو گیا ہے، اس کے پیش نظر فی الحال یہ کوشش بے سود ہو گی کہ مروّجہ فقہی اختلافات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے اور تعبیر و تشریح کے ان مختلف طریقوں کو ہم آہنگ کیا جائے جو اس پیچیدگی اور اجتہادی قیاسات کے ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ اگر ہم اسلام کے نفاذ کا ایک عملی، اور قابلِ عمل، نظام ترتیب دینا چاہتے ہیں تو ہمیں ایسے تمام معاملات سے احتراز کرتے ہوئے جن میں تعبیر اور قیاس سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، اپنے آپ کو ان بدیہی شرعی قوانین تک محدود کرنا ہو گا جو قرآن وسنت میں واضح اور جامع الفاظ میں دیے گئے ہیں اور جن کے متعلق اسلامی فکر کے مختلف مکتبہ ہائے فکر میں کوئی اختلاف یا نزع نہیں پایا جاتا۔ اگر ایسے قوانین کی تدوین کر دی جائے تو اس اتفاق رائے کی کم سے کم بنیاد فراہم ہو سکے گی جو اسلام کی تشکیل جدید کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے درکار ہے۔

چنانچہ اس محکمے کی جانب سے تمام مسالک کے علماء کو صلائے عام ہے کہ وہ اپنے ممتاز ترین نمائندوں کو شریعت کمیٹی کی رکنیت کے لیے نامزد کریں، جو مستقبل قریب میں قائم کی جائے گی۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہو گا کہ معاشرتی اور معاشی حوالوں سے قرآن وسنت کے ایسے قوانین کی ترتیب و تدوین کریں جن کا شمار ''نصوص'' کے زمرے میں کیا جاتا ہے، یعنی جو اپنے واضح اور قطعی الفاظ کے باعث معین مفہوم رکھتے ہیں اور یوں متضاد تشریحات کے رحم و کرم پر نہیں ہوتے۔ اس امر کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ معاملہ کسی بھی طرح شرعی قوانین کی تسوید (drafting) یا بازتسوید (redrafting) کا نہیں ہے۔ کمیٹی کو جو شرائطِ حوالہ تفویض کی جائیں گی، ان کے تحت اسے صرف نصوص پر مبنی احکام قرآن اور متفق علیہ مستند روایات کو اکٹھا کر

کے انہیں مخصوص عنوانات کے تحت ترتیب دینا ہوگا۔ امید ہے کہ اس طرح سماجی معاملات سے متعلق اسلامی قوانین کا ایک نسبتاً محدود ضابطہ تشکیل دینا ممکن ہو جائے گا جسے مختلف مسالک کے درمیان سب سے بڑا مشترک قدر نما قرار دیا جا سکے گا۔ اگر ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ملت اسلامیہ کے پاس عوامی اہمیت کے سوالات سے متعلق شرعی قوانین کا ایک اساسی خاکہ تیار ہو جائے گا جسے اس سمت میں مزید سوچ بچار کے لیے بنیاد اور عملی قانون سازی کے سلسلے میں نقطہ آغاز بنایا جا سکے گا۔

iii) اسلامی قانون اور اقتصادیات

علماءِ دین اور ماہرین اقتصادیات پر مشتمل ایک اور کمیٹی ہماری معاشی زندگی کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے سلسلے میں عملی تجاویز مرتب کرے گی۔ یہ کمیٹی جن بنیادوں پر اپنا کام شروع کرے گی' وہ شرعی قوانین کے درج بالا ضابطے سے اخذ کی جائیں گی۔ اس کمیٹی کی شرائطِ حوالہ میں بعض جدید معاشی مسائل ـــــ مثلاً بینکنگ' لائف انشورنس' کریڈٹ پر خریداری کے معاملات' مشترکہ استعمال کے لیے ذاتی جائیداد کا حصول' زرعی اصلاحات (بشمول زمینوں کو قومیانے کا مسئلہ) اور وراثت کے قوانین وغیرہ ـــــ کی اسلامی قوانین کی مناسبت سے تحقیق شامل ہوگی۔ اس سارے عمل سے مقصود یہ نہیں ہے کہ معاشی منصوبہ بندی کا کوئی بنیادی خاکہ پیش کیا جائے۔ یہ کام دیگر اداروں کے سپرد کیا جانا چاہیے۔ اس کمیٹی سے صرف یہ توقع کی جائے گی کہ وہ:

ا) چند مخصوص معاشی مسائل کے حوالے سے اسلامی قانون کا منہج واضح کرے۔

ب) یہ معلوم کرے کہ دورِ حاضر کی ضروریاتِ زندگی کو اسلام کے معاشی تصورات کے مطابق کیسے ڈھالا جا سکتا ہے۔

اس تحقیق کے نتائج بعد ازاں ریاست کے ان قانون ساز اداروں کے استعمال میں آ سکتے ہیں جنہیں باضابطہ طور پر قائم کیا جائے گا۔

iv) اوقاف میں ہم آہنگی

اس ملک میں بے شمار وقف املاک اور عوامی مذہبی ادارے ہیں۔ ان میں بعض کی آمدنی خاصی معقول ہے۔ یہ ادارے مختلف اوقات میں اس مطمحِ نظر سے قائم کیے جاتے رہے کہ معاشرے میں عبادت' تعلیم اور سماجی خدمات کے شعبوں میں دلچسپی کو فروغ دیا جا سکے۔ چند وقف املاک اور اداروں کو خوش اسلوبی سے چلایا جا رہا ہے۔ تاہم' ان کی غالب اکثریت پرلے درجے کی بدانتظامی کا شکار ہے' جبکہ کچھ کا کسی ذلت وندامت کے خوف کے بغیر اس لیے استحصال کیا جا رہا ہے کہ محض چند ایک متولیوں کو فائدہ پہنچایا جا سکے۔ فنڈز کے بے جا تصرف کے علاوہ' جو کئی مثالوں سے واضح ہے' ان تمام اداروں کے بے ہنگم کام کرنے کے باعث پیسے کا بہت بڑے پیمانے پر ضیاع ہو رہا ہے اور بہت سی سہولیات جو ملت اسلامیہ کے مفاد کے لیے تعمیری انداز میں استعمال ہو سکتی تھیں' اب ضائع کی جا رہی ہیں۔ کئی نیک طینت مسلمانوں کی

طرف سے مسلسل یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ان تمام اوقاف کو ایک مرکزی مقتدر ادارے کی زیرنگرانی لا کر باہم مربوط کیا جائے تاکہ نہ صرف بدانتظامی بلکہ سرگرمیوں کی فضول دہرائی سے بھی بچا جا سکے۔ ایسا مرکزی مقتدر ادارہ ظاہر ہے کہ ایک اسلامی حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے تو معاشرے کو ایک مرکزی ذریعے سے خاصی معقول آمدنی ہو سکتی ہے' جسے ان نیک افراد کی خواہش کے مطابق مسلمانوں کی فلاح کے لیے استعمال کیا جا سکے گا جنہوں نے ماضی میں وقف کی یہ املاک اور ادارے قائم کیے تھے۔ متعلقہ اداروں کی جائز اور قانونی ضروریات پوری کرنے کے بعد بچنے والی رقم سے (ممکنہ طور پر قاہرہ کی جامعۃ الازہر کی طرز پر) علماء کی ایک عظیم الشان درس گاہ قائم کی اور چلائی جا سکتی ہے جو نسل در نسل صحیح معنوں میں اسلام کے حقیقی علماء پیدا کرتی رہے گی' اور یوں پاکستان کو مسلم دنیا کا روحانی مرکز بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرے گی۔

اس ضمن میں محکمہ برائے اسلامی تشکیل جدید کے پیش نظر جید علماء اور دوسرے معزز شہریوں پر مشتمل ایک کمیٹی کا قیام ہے جو وقف کی املاک کے مسئلے کا شرعی زاویہ نگاہ سے جائزہ لے کر اور تمام نقطہ ہائے نظر زیرغور لانے کے بعد اس ملک میں اوقاف سے متعلق تمام امور میں ہم آہنگی لانے کے لیے ایک واضح منصوبہ تیار کر کے حکومت کو پیش کرے گی۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کا اہتمام حکومت کی جانب سے تشکیل کردہ ایک بااختیار ادارے کے ذریعے کیا جائے گا۔

v) اجتماعی عزم

ہماری اجتماعی زندگی کا سب سے تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ اسلامی اور معاشرتی حوالوں سے ہمارا ذہنی رویہ انتہائی پست ہو چکا ہے۔ اگر پاکستان کو اپنا مطلوبہ مقصد حاصل کرنا اور دوبارہ ابھرتی ہوئی اسلامی تہذیب کا مرکز و محور بننا ہے تو اس انتشار کی اصلاح کے لیے تمام مخلص مسلمانوں کا عملی تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ بصورت دیگر' حکومت چاہے کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو' ہمارے زاویۂ نگاہ میں وہ تبدیلی نہیں آ سکے گی جو صحیح معنوں میں ملت اسلامیہ بننے کے لیے ہمیں درکار ہے۔

اس بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ ہم' یعنی پاکستان کے عوام ہی تھے —— جدید مسلم دنیا میں واحد مثال —— جنہوں نے نسل اور قومیت پر قائم خودغرضانہ تعصّبات کو توڑ کر یہ اعلان کیا کہ ہم ایک ایسی ریاست قائم کریں گے جس کی بنیاد اس حقیقت کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگی کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا اب تک کا رویہ اس تصور کی مناسبت سے خواہ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو' اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جدوجہد جس کے نتیجے میں پاکستان کا قیام ممکن ہوا' موجودہ عالم اسلام کی ایسی واحد عوامی تحریک ہے جس کے اعلان شدہ مقاصد میں اسلامی طرزِ حکومت کا نفاذ شامل ہے۔ چنانچہ یہ ہمارا اخلاقی معیار' ہمارا طرزِ عمل اور ہمارے اقدامات ہی ہیں جو آئندہ کئی نسلوں تک اسلام کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے —— غالباً نہ صرف ہمارے اپنے ملک میں بلکہ ان تمام ممالک میں جہاں مسلمان بستے ہیں۔

اگر ہم یعنی پاکستان کے لوگ اپنے ملک کو پوری طرح سے ایک اسلامی ریاست بنانے میں کامیاب ہو

جاتے ہیں‘ اگر ہم مایوسی اور نا امیدی کی شکار دنیا کو یہ باور کرانے کے قابل ہو جاتے ہیں کہ اسلام فی الحقیقت بنی نوع انسان کی معاشرتی اور سیاسی برائیوں کا حل فراہم کرتا ہے‘ تو دیگر تمام مسلم اقوام جلد یا بدیر ہماری مثال کی تقلید کرنے پر مجبور ہوں گی‘ اور یوں اسلام کی عظمتِ رفتہ بحال ہو جائے گی۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہم اپنی جدوجہد میں ناکام ہو جاتے ہیں تو نہ صرف پاکستانی عوام ہی اسلام کے عملی بیانیے سے برگشتہ ہوں گے بلکہ پوری مسلم دنیا‘ جو اس وقت ہماری جانب امید کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے‘ انتہائی مایوس ہو جائے گی اور اس سوچ کو ہمیشہ کے لیے قبول کر لے گی کہ مذہب کو کسی قوم کی سیاست اور معیشت کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا —— اور یہی وہ نظریہ ہے جس کا پرچار ہمارے دشمن بڑی تن دہی سے کر رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں‘ اگر ہم اپنے عظیم مقصد کو حاصل کر لیتے ہیں تو ہمارے ساتھ پورا عالم اسلام بھی اسے اپنا نصب العین بنا لے گا‘ جبکہ اگر ہم راہ سے بھٹک گئے تو ساری مسلم دنیا بھی اپنی راہ کھوٹی کر لے گی‘ اور صدیوں تک لوگ کسی اسلامی ریاست کے قیام کے امکان پر بھی غور نہیں کریں گے۔

اسی لیے ہمیں کسی صورت ناکام نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس ہمیں اس عظیم ذمہ داری کو ضرور اٹھانا چاہیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں منتخب کیا ہے۔ اسے ایک فرض سمجھتے ہوئے ہمیں دنیا کے سامنے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اسلام نہ صرف اس دور بلکہ ہر دور کے لیے ایک عملی اور قابل عمل ضابطہ حیات پیش کرتا ہے۔ اگر ہم اس ذمہ داری کی اہمیت کو محسوس کر لیں تو ہماری موجودہ کمزوری جلد ہی ہماری طاقت کا ذریعہ بن جائے گی‘ کیونکہ جن آزمائشوں کا آج ہمیں سامنا ہے‘ انہیں بدقسمتی یا عذابِ الٰہی قرار دینے کے بجائے ہم ایک ایسی قربانی کے طور پر دیکھیں گے جس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ اپنے ان برگزیدہ بندوں سے کرتا ہے جن سے کوئی خاص کام لینا مقصود ہو۔ بلاشبہ‘ اس نے پاکستان کے عوام کو اس مقصد کی انجام دہی کے لیے چُن لیا ہے جو کسی بھی قوم کے لیے عظیم ترین اور رفیع الشان ہو سکتا ہے‘ یعنی:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۴﴾ (آل عمران)

’’اور تم میں سے ایک گروہ ضرور ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے اور برائی سے منع کرے‘ اور بے شک یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔‘‘

ہم اللہ تعالیٰ کی جانب سے تفویض کردہ اس مشن سے اس وقت تک مخلص نہیں ہو سکتے‘ نہ اسلامی نظام سیاست قائم کرنے کا ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے جب تک کہ ہم اپنی ان رُسوا کن عادات سے چھٹکارا حاصل نہیں کرتے جو دورِ زوال میں ہمارا مقدر بنیں‘ اور اپنی موجودہ حالت سے زیادہ دیانت دار‘ زیادہ راست باز نہیں بن جاتے۔ مختصراً یہ کہ ہمیں زیادہ تہذیب کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اگر ہم دنیا کو انصاف پسندی کی دعوت دینا چاہتے ہیں تو پہلے ہمیں خود اپنے اندر کمزوروں کے ساتھ انصاف سے پیش آنے کی صفت پیدا کرنا ہوگی۔ دوسروں کو حق کی نصیحت کرنے اور غلط سے روکنے کے لیے ضروری ہے کہ خود اپنا تنقیدی جائزہ لینا سیکھیں۔ اگر ہم روحانی طور پر آسودہ ہونا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ مادہ پرستی کی جانب کم

سے کم مائل ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سے ایمان اور ہمت' ایمان داری اور عزتِ نفس' پاکیزہ خیالات اور نیک اعمال کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ان لوگوں سے جو اپنے آپ کو اسلام کے وفادار کہتے ہیں' کوئی بڑا مطالبہ نہیں ہے' نہ اس مستقبل کے بدلے کوئی بڑی قیمت ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے ساتھ کیا ہے۔ بہرحال' اسلام کا یہ مطالبہ ہمیں پورا کرنا ہوگا' گویا یہ عوضانہ ہے اس رتبے کا جو ایک مسلمان ہونے کے باعث ہمیں حاصل ہے۔

محکمہ برائے اسلامی تشکیلِ جدید کا سب سے اہم فریضہ یہ ہوگا کہ اس ملک کے ہر عاقل شہری تک' چاہے وہ مرد ہو یا عورت' اسلام کا عملی پیغام پہنچائے' اس لیے کہ اگر ہم اسلام کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو پہلے ہمیں اپنی سوچ کو اسلام کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ نہایت توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ تیار کردہ ایک تفصیلی منصوبے کے مطابق یہ محکمہ ملت اسلامیہ کو درپیش سماجی' اخلاقی اور عملی مسائل سے متعلق سلسلہ وار مطبوعات شائع کرے گا۔ ان کمیٹیوں کی رپورٹس کے علاوہ جن کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا گیا ہے' ہم درج ذیل مواد بھی شائع کریں گے:

ا) ممتاز اسلامی مفکّرین کے تحریر کردہ پمفلٹ

ب) اخبارات میں دیے گئے مضامین

ج) ریڈیو پر نشر کیے گئے مباحث

یہ سب کچھ اسلامی تشکیل جدید سے متعلق دلچسپ موضوعات پر مشتمل ہوگا۔

ہم دروسِ قرآن کا ایک سلسلہ بھی شروع کریں گے جو ریڈیو پاکستان پر باقاعدگی سے نشر ہوگا۔ اس کے لیے معروف علماء اور دانشوروں کا تعاون حاصل کیا جائے گا۔ ان تقاریر میں دورِ حاضر کے مسائل کے حوالے سے قرآنی تعلیمات کی تشریح کی جائے گی' اور یوں معاشرہ کلام الٰہی سے عملی ہدایت حاصل کر سکے گا۔ بہتر حالات میں' جب ہمارا محکمہ پوری طرح منظّم ہو جائے گا' ہم مساجد اور عوامی اجتماعات میں مسلمان عوام سے براہِ راست رابطہ کریں گے۔ ایسا محض پند و نصیحت کے لیے نہیں ہوگا' بلکہ اس عمل کے ذریعے مسلمان قوم کے روحانی وسائل اور صلاحیتوں کو متحرک کر کے دو مقاصد حاصل کیے جائیں گے۔ اول' ایک اسلامی طرزِ حکومت کی تشکیل کا عظیم اور نیک کام' جو اپنے نام کے شایانِ شان ہو۔ دوم' اس باطنی پستی اور اخلاقی و معاشرتی فساد پر قابو پانا جس نے دورِ غلامی سے ملت کے قلب کو بے نور کر رکھا ہے۔ اس مشن کو مکمل کرنے کے لیے یہ محکمہ حکومت کو وقتاً فوقتاً مختلف تجاویز پیش کرتا رہے گا۔ ان میں سے کچھ ایسی ہوں گی جن پر کسی قانون سازی کے بغیر فوری عمل درآمد کیا جا سکے گا جبکہ بعض کے لیے نئے قوانین تشکیل دینا ضروری ہوگا۔

ہم اس امر پر غور کر رہے ہیں کہ کچھ عرصے کے بعد اس محکمے کی علاقائی مجالس بھی قائم کی جائیں۔ اس کا آغاز لاہور سے ہوگا' اور پھر رفتہ رفتہ ان مجالس کا جال پورے ملک میں پھیلا دیا جائے گا۔ یہ علاقائی مجالس معزز شہریوں اور سماجی کارکنوں پر مشتمل ہوں گی۔ یہ سب ہمیں اس کام میں مدد دیں گے کہ مسلم طبقات' جو مسلسل توسیع پذیر ہیں' انہیں صف آرا کیا جائے تاکہ وہ صحیح معنوں میں ایک اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کے لیے

جدوجہد کرسکیں۔

قصہ مختصر، ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ محکمہ برائے اسلامی تشکیل جدید کو ایک طرح سے ایسے افکار اور ایسی سرگرمیوں کے مرکز کی حیثیت دی جائے جن کا اجتماعی مقصد ملتِ اسلامیہ کی مذہبی و معاشرتی سربلندی کا حصول ہو۔ یہ امر عیاں ہے کہ اتنے بڑے حجم کے کسی بھی منصوبے پر، جس میں وقت کے ساتھ کام کے بڑھنے کا مزید امکان ہے، عمل درآمد مرحلہ وار ہی ہوسکتا ہے، فی الفور نہیں۔ ہمارے محکمے کو کام شروع کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا، جبکہ ہماری سرگرمیاں ابھی چھوٹی سطح کی ہیں۔ چنانچہ اپنی قوم سے ہماری استدعا ہے کہ ہمارے کام کے بارے میں تحمل کا مظاہرہ کرے اور معجزات کی توقع نہ کرے۔ ہم صرف محنت اور کوشش کر سکتے ہیں —— اور ہماری قوم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اس طرح تعاون کرے کہ ہماری جِدّوجُہد کامیابی سے ہم کنار ہو جائے۔ تعاون کی ایک شکل جسے ہم آغاز ہی میں حاصل کرنا چاہیں گے —— ایک ایسی معاونت جس کے لیے درحقیقت خود حکومت کو بھی اصرار کرنا چاہیے —— یہ ہے کہ عوام دوسروں میں اور خود اپنے اندر امید، عزم اور معاشرتی یک جہتی کا جذبہ پیدا کریں۔ اسی قسم کے تعاون کی بدولت ہی ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کا ہمارا خواب سچ ثابت ہوسکتا ہے۔

میں اللہ ربّ العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کو دانائی اور اخلاقی قوت عطا کرے تاکہ عظمت اسلام کے لیے کام کیا جاسکے! والتوفیق من اللّٰہ!"

[Aims and Objects of the Department of ISLAMIC RECONSTRUCTION, By Muhammad Asad, Printed by the Superintendent, Government Printing, West Punjab, 1947.]

[مترجم: محمد خلیق / میجر (ریٹائرڈ) حیدر حسن]

اعتذار

حکمتِ قرآن کے شمارہ جولائی۔ ستمبر 2017ء کے اداریہ بعنوان ''قرآن کی مرکزیت'' میں ''اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقِیْقَۃَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ'' کو رسول اللہ ﷺ کے معمولات میں شامل دعا تحریر کیا گیا تھا۔ اس پر ایک لائقِ احترام قاری نے توجہ دلائی ہے کہ یہ مسنون دعا نہیں ہے۔ گمان غالب ہے کہ اگرچہ احادیثِ نبویہؐ سے یہ مضمون متبادر ہوتا ہے، مگر مذکورہ بالا الفاظ کسی مسنون دعا کے نہیں ہیں۔ چنانچہ اس غلطی پر ادارۂ حکمتِ قرآن اللہ ربّ العزت کے حضور عفو و درگزر کا طلب گار اور قارئین سے معذرت خواہ ہے۔

مِلاکُ التأوِیل (۱۲)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃُ النِّساء

(۷۴) آیات ۱۳۰ تا ۱۳۲:

﴿وَاِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنْ سَعَتِہٖ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیْمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ وَاِنْ تَکْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ غَنِیًّا حَمِیْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ﴿۱۳۲﴾﴾

''اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا' اور اللہ وسعت والا' حکمت والا ہے۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے' اور ہم نے ان لوگوں کو جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور تمہیں بھی اس بات کی وصیت کی ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور اگر تم انکار کرو گے تو جان لو کہ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے' اور اللہ بہت بے نیاز اور قابل تعریف ہے۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے' اور زمین میں ہے' اور کافی ہے اللہ کے لیے کہ وہ کارساز ہے۔''

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں آیات کے اختتامیہ میں اختلاف کیوں ہے؟

پہلی آیت کے آخر میں کہا گیا: ﴿وَکَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیْمًا ﴿۱۳۰﴾﴾

دوسری آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَکَانَ اللّٰہُ غَنِیًّا حَمِیْدًا ﴿۱۳۱﴾﴾

اور تیسری آیت میں کہا: ﴿وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ﴿۱۳۲﴾﴾

دوسرا سوال یہ کہ ﴿وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ کی تین مرتبہ تکرار کیوں کی گئی' حالانکہ ایک کلام دوسرے کلام سے متّصل ہے یعنی دونوں میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے؟

اب جواب ملاحظہ ہو۔ پہلی آیت میں زوجین کے درمیان نزاع کا ذکر ہے اور یہ کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ نہیں رہ سکتے' اس لیے ان دونوں کے حق میں فرمایا: ﴿وَاِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنْ

سَعَتِهٖ﴾ ''اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا''۔ زمخشری کہتے ہیں ''یعنی اسے پہلے سے بہتر زوج عطا کرے گا اور پہلے سے زیادہ بابرکت معیشت عطا کرے گا''۔ اور جب یہ کہا کہ ''اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا'' تو یہاں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ وسعت اور حکمت کی طرف اشارہ کرنا نہایت مناسب تھا' یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کا احسان بے پایاں ہے' ان کی معیشت کو بامراد برقرار رکھنے کے لیے اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ ہر ایک کو بطور کمال رزق' رہائش اور اسبابِ اُنسیت فراہم کرنے پر قادر ہے' اور صرف اللہ ہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ ان کے پہلے قریب ہونے اور پھر جدا ہونے میں کیا حکمت ہے۔ اس لیے آخر میں فرمایا: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ۝۱۳۰﴾ یعنی دینے پر آتا ہے تو خوب دیتا ہے' احسان کرنے پر آتا ہے تو اس کی کوئی حد نہیں' اور وہی جانتا ہے کہ بندوں کے لیے کیا کیا مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔

تو یہاں یہ بات ظاہر ہو گئی کہ جہاں ''ان کے جدا ہونے کے بعد اللہ انہیں اپنی وسعت سے دے گا'' کا تذکرہ ہے تو وہاں اس کے بعد اللہ کی وسعت اور حکمت کا تذکرہ انتہائی مناسب تھا۔ اور پھر یہ بھی مناسب تھا کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت و دولت کی طرف اشارہ ہو جائے' اسی لیے آخر میں یہ بھی فرما دیا: ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾۔

یہاں تک تو ایک خاص معاملے کی طرف اشارہ تھا۔ اس کے بعد عمومی طور پر اگلے' پچھلے تمام لوگوں کی طرف کیے گئے احسان کو یاد دلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتابوں سے نواز کر ان پر ایک عظیم احسان کیا ہے اور انہیں تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت دے کر انہیں دردناک عذاب سے نجات دلائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے تقویٰ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا کہ وہ ان سے اور ان کی عبادت سے بے نیاز ہے۔ اگر وہ کفر کا راستہ بھی اختیار کریں تو اللہ کا کیا بگاڑ لیں گے' اللہ کے لیے تو وہ سب کچھ ہے جو زمین اور آسمان میں ہے۔ اور اس بات کو دوسری جگہوں پر بھی بیان کیا۔ فرمایا:

﴿وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۸﴾ (ابراھیم)

''اور موسیٰؑ نے کہا: اگر تم اور جو بھی زمین میں ہے سب کے سب کفر کریں تو (جان لیں کہ) اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور قابل تعریف ہے''۔

اور ارشاد فرمایا:

﴿فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۶﴾ (التغابن)

''اور انہوں نے کفر کیا اور پیچھے ہٹ گئے اور اللہ نے بے نیازی دکھائی' اور اللہ بے نیاز ہے' قابل تعریف ہے۔''

گویا اس بات کا اظہار ہو گیا کہ زمین و آسمان کی ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے' اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابند ہے' وہ اللہ کے ارادے اور مشیت سے باہر نہیں جا سکتے۔ وہ سب اُس کی مٹھی میں ہیں' وہ جو چاہتا ہے ان کے ساتھ کرتا ہے اور ان سے بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے' اس لیے کہ وہ غنی ہے' حمید ہے۔ اور اسی بات کی تائید ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ سے کردی گئی۔

آخر میں ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾ یعنی اللہ ہی کارساز ہے' فرمایا اور تاکیداً یہاں بھی ﴿لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کا اعادہ کردیا تاکہ معلوم رہے کہ وہی ان کی دیکھ بھال کرنے والا ہے' وہ اکیلا ہی ان کا مدبر ہے' وہی ان سب کو سنبھالنے والا ہے۔ اگر وہ زائل ہو جائیں تو کوئی دوسرا انہیں سنبھال نہیں سکتا۔ اور یوں ان آیات کا اختتام انتہائی مناسب طریقے سے کیا گیا۔ واللہ اعلم!

(۷۵) آیت ۱۳۵:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾

''اے ایمان والو! عدل وانصاف پر کھڑے ہو جاؤ اور اللہ کی رضا کی خاطر گواہ بن جاؤ۔''

اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۸ میں ارشاد فرمایا:

﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾

''اور تم اللہ کی خاطر کھڑے ہو جاؤ اور عدل وانصاف کے ساتھ گواہی دو۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''بِالْقِسْطِ'' کا لفظ سورۃ النساء کی آیت میں پہلے اور سورۃ المائدۃ کی آیت میں بعد میں لایا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیت سے قبل وہ چند آیات ہیں جن میں عدل وانصاف (قِسط) کا حکم دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ (آیت ۱۲۳) ''جو بدی کرتا ہے' وہ اس کی جزا پائے گا۔''

پھر فرمایا:

﴿وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِى النِّسَآءِ ؕ﴾ (آیت ۱۲۷) ''وہ آپ سے عورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔''

اور اس ضمن میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ﴾ (آیت ۱۲۷) ''اور یہ کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف کرو۔''

اور پھر یہی مضمون اس سے اگلی آیات میں بھی بیان ہوا تو اس وجہ سے ''بِالْقِسْطِ'' کا پہلے لانا مناسب تھا۔ لیکن سورۃ المائدۃ کی آیت سے قبل طہارت کا حکم ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں یاد دلائی ہیں اور عہد کی پابندی کا حکم دیا ہے' تقویٰ کی ہدایت کی ہے' اس لیے وہاں ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ﴾ کہنا زیادہ مناسب تھا اور اس کے بعد انصاف پر مبنی گواہی کا تذکرہ نہایت معقول تھا۔

یعنی دونوں آیات کے ماسبق کا اگر لحاظ رکھا جائے تو یہ مضمون واضح ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم!

(۷۶) آیت ۱۳۷:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾﴾

''جولوگ ایمان لائے پھرانہوں نے کفر کیا' پھر ایمان لائے اور پھر کفر کیا' اور پھر اپنے کفر میں بڑھتے گئے' اللہ نہ ان کی مغفرت کرے گا اور نہ ہی انہیں راہِ راست پر لائے گا۔''

اور پھر اسی سورت کی آیت ۱۶۸۔۱۶۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَلَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ طَرِیْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِیْقَ جَھَنَّمَ﴾

''بے شک جن لوگوں نے کفر اور ظلم کا ارتکاب کیا' اللہ نہ ہی انہیں معاف کرے گا اور نہ ہی انہیں سوائے جہنم کی راہ کے' کسی راہ کی طرف ہدایت دے گا۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں آیتوں میں ان لوگوں کا ذکر ہوا ہے جنہوں نے کفر کیا' کفر میں بڑھتے گئے' اور پھر ان کی ایک جیسی جزا کا بھی ذکر ہوا کہ ان کی مغفرت نہ ہوگی اور نہ ہی انہیں راہِ ہدایت نصیب ہوگی' لیکن راہِ ہدایت کے لیے پہلی آیت میں لفظ ''سبیل'' لایا گیا جب کہ دوسری آیت میں لفظ ''طریق'' لایا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ گو دونوں الفاظ اپنے معنی کے اعتبار سے ایک ہی ہیں' لیکن دونوں میں ایک واضح فرق ہے اور وہ یہ کہ لفظ ''سبیل'' کے معنی میں وہ توسع اور عموم پایا جاتا ہے جو لفظ ''طریق'' میں نہیں پایا جاتا۔ اسی لیے کتابِ عزیز کے ربع اوّل (یعنی سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الانعام تک) میں ''سبیل'' کا لفظ پچاس سے زیادہ دفعہ آیا ہے۔

سورۃ البقرۃ میں ۱۴ جگہ۔

سب سے پہلے آیت ۱۰۸ میں:

﴿وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۰۸﴾﴾

''اور جو ایمان کے بدلے میں کفر اختیار کرتا ہے وہ راہِ راست سے بھٹک گیا۔''

اور سب سے آخر میں آیت ۲۷۳ میں:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾

''ان فقراء کے لیے جو اللہ کی راہ میں روک دیے گئے۔''

سورۂ آل عمران میں ۷ جگہ' سورۃ النساء میں ۱۶ جگہ' سورۃ المائدۃ اور سورۃ الانعام میں ۶ جگہ۔ اور جہاں تک لفظ ''طریق'' کا تعلق ہے تو وہ سارے قرآن میں صرف چار جگہ وارد ہوا ہے۔ پھر ''سبیل'' کا لفظ زیادہ تر خیر و سلامتی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ کہیں صاف صاف اور کہیں بطور اشارہ' لیکن لفظ ''طریق'' سے خیر و سلامتی اسی وقت مراد ہوتی ہے جب اس کے ساتھ خیر و سلامتی کا ذکر بطور وصف یا اضافت ہو' جیسے سورۃ الاحقاف میں ارشاد فرمایا:

﴿یَھْدِیْ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۳۰﴾﴾

''وہ حق کی طرف ہدایت دیتی ہے اور سیدھے راستے کی طرف۔''

اب غور فرمائیے کہ پہلی آیت میں ان لوگوں پر شدید نکیر کی گئی ہے جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا' پھر ایمان لائے اور پھر کفر کیا اور پھر کفر میں بڑھتے گئے۔ ان لوگوں کا حال ان لوگوں سے مختلف ہے جو شروع ہی سے کافر رہے اور وہ کبھی ایمان نہ لائے تھے۔

اسی قسم کی دوسری آیت سورۃ النحل کی ہے جہاں ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾﴾

''جو شخص اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کا مرتکب ہوتا ہے اِلا یہ کہ اسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر اطمینان رکھتا ہو' مگر جو کھلے دل سے کفر کرے تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور بہت بڑا عذاب ہے۔''

اور اگلی آیت میں ان کا یہ جرم بھی بیان ہوا کہ آخرت پر ایمان لانے کے بعد انہوں نے دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی' تو یہ وہ لوگ ہیں جو علم کے حاصل ہو جانے کے بعد گمراہی میں پڑ جاتے ہیں اور یہی لوگ بدترین لوگ ہیں۔ اور جہاں تک دوسرے گروہ کفار کا تعلق ہے جن کا تذکرہ دوسری آیت میں کیا گیا تو وہ پہلے گروہ سے اپنی گمراہی اور قباحت جرم میں کم ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ جو علم کے باوجود کفر کا راستہ اختیار کرتے ہیں' ایمان لا کر کفر کے مرتکب ہوتے ہیں وہ ان لوگوں سے کہیں بڑے مجرم ہیں جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ جس میں گناہ اور کفر دونوں شامل ہیں' لیکن بار بار ایمان لا کر کفر کا ارتکاب نہیں کیا۔ اسی اعتبار سے پہلے گروہ کے لیے ہر طرح کی راہ (سبیل) بند کیے جانے کا عندیہ دیا گیا اور دوسرے گروہ کے لیے وہ لفظ (یعنی طریق) استعمال کیا گیا جس میں سبیل کے مقابلے میں عمومیت کم پائی جاتی ہے' اور اس طرح ہر دو الفاظ کا استعمال اپنی اپنی جگہ پر بالکل مناسب دکھائی دیتا ہے اور اگر اس کا الٹ کیا جاتا تو قطعاً غیر مناسب ہوتا' واللہ اعلم!

(۷۷) آیت ۱۴۹:

﴿اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾﴾

''اگر تم کسی نیکی کے کام کو ظاہر کرو یا چھپاؤ یا کسی برائی سے درگزر کرو تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور پوری قدرت رکھنے والا ہے۔''

اور سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۴ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۵۴﴾﴾

''اگر تم کسی چیز کو ظاہر کرو یا چھپاؤ تو جان لو کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

یہاں تین سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) سورۃ النساء میں ''اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا'' جبکہ سورۃ الاحزاب میں ''اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا'' کہا۔

(۲) دونوں آیتوں کے جوابِ شرط میں اختلاف کیوں ہے؟ پہلی میں کہا گیا: ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾﴾ اور دوسری میں کہا گیا: ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۵۴﴾﴾

(۳) پہلی آیت میں ﴿اَوْ تَعْفُوْ عَنْ سُوْٓءٍ﴾ کا اضافہ ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ﴿اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ﴾ سورۃ النساء کے عمومی مضامین کے مطابق ہے جس میں مختلف خیر کے کاموں پر ابھارا گیا ہے' آپس کے جھگڑوں کو چکانے' معاف کرنے' برائیوں سے درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ وراثت کی تقسیم کے وقت ورثاء کو ان حاجت مندوں اور قرابت داروں کے بارے میں وصیت کی گئی جو اس وقت حاضر ہو چکے ہوں۔ فرمایا:

﴿فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۸﴾ (النساء)

''تو انہیں اس میں سے کچھ دے دلا دو اور ان سے اچھی طرح مخاطب ہو۔''

وہ دو لوگ جو بدکاری کے مرتکب ہوئے ہوں' ان کے بارے میں فرمایا:

﴿فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ﴾ (النساء:۱۶)

''پس اگر وہ دونوں توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان سے درگزر کرو۔''

عورتوں سے حسن سلوک کا حکم دیا:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ﴾ (النساء:۱۹)

''اور ان کے ساتھ اچھے طریقے کے ساتھ رہو۔''

پھر فرمایا:

﴿فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ﴾ (النساء:۳۴)

''پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان پر کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔''

منافقین کے بارے میں فرمایا:

﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ۝۶۳﴾ (النساء)

''تو ان سے چشم پوشی کیجیے' انہیں نصیحت کیجیے اور انہیں وہ بات کہیے جو ان کے دلوں میں گھر کرنے والی ہو۔''

بیویوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۲۹﴾ (النساء)

''اور اگر تم اصلاح کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک اللہ غفور ہے' رحیم ہے۔''

اور اس طرح کے بے شمار دوسرے احکامات ہیں جن کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا' اور جس کثرت سے یہ احکام اس سورت میں آئے ہیں دوسری کسی سورت میں نہیں آئے' اسی لیے اس سورت میں طلاق کے احکام نہیں دیے گئے' حالانکہ اس سورت کا اساسی موضوع عورتوں ہی کے بارے میں ہے۔ زیادہ تر وہی احکام دیے گئے جن میں تالیف قلب اور اصلاح کا پہلو سرفہرست ہے۔

طلاق کے ضمن میں صرف اتنا کہا گیا: ﴿وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ﴾ (النساء:۱۳۰) ''اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا''۔ یہاں بھی وہ انداز اختیار کیا گیا ہے

جس میں انسیت کا اظہار ہے اور مختصر الفاظ میں جدائی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں نہ لعان کا ذکر ہے' نہ ظہار یا خلع یا تین طلاقوں کا' بلکہ حسن معاشرت کا اور وراثت کے احکامات کا بیان ہے۔ اور سورت کے اسی موضوع کے اعتبار سے مناسب تھا کہ اس میں بھلائی کے مختلف راستوں کا ذکر ہوتا اور اگر بھلائی کی ضد کا بھی تذکرہ ہوتا تو معافی کے ذکر کے ساتھ مشروط ہوتا۔ اسی لیے متذکرہ آیت میں معاف کرنے کا خاص طور پر ذکر کیا گیا:

﴿اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ﴾

ملاحظہ فرمائیں کہ سورۃ البقرۃ میں بھی جہاں عورتوں کے احکامات بیان ہوئے ہیں وہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ط﴾ (آیت ۲۳۷)

''اور اگر تم معاف کرو تو وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔''

جہاں تک سورۃ الاحزاب کی آیت کا تعلق ہے تو یہاں خیر و شر دونوں مراد ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں کہ اس سورت میں کیا کیا باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ط﴾ (آیت ۵۳)

''اور تمہارے لیے روا نہیں ہے کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ ہی ان کے بعد ان کی بیویوں سے کبھی بھی نکاح کرو۔''

اس سے قبل منافقین کی بدعملی کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا' مثلاً ان کا کہنا: ﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ⑫﴾ ''اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) نے جو وعدہ ہم سے کیا تھا وہ صرف دھوکہ تھا''۔ اور پھر جنگ سے بھاگنے کے لیے یہ عذرِ لنگ پیش کیا: ﴿اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ط﴾ (آیت ۱۳) ''ہمارے گھر تو یقیناً بالکل کھلے (یعنی غیر محفوظ) ہیں''۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹ کو واشگاف کیا' ان کی کارگزاریوں سے اہل ایمان کو خبردار کیا' انہیں بتایا کہ اللہ پر کوئی بات مخفی نہیں ہے' چاہے کوئی چھپائے یا ظاہر کرے' اور اسی بات کو یوں ارشاد فرمایا: ﴿اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ﴾ یہاں ''شَیْئًا'' کہہ کر اس لفظ سے خیر و شر دونوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ لفظ ''شیئ'' کا اطلاق ہر چیز پر ہوتا ہے چاہے وہ محسوس کی جا سکتی ہو یا صرف معنوی حیثیت رکھتی ہو' بلکہ بعض متکلمین کے نزدیک تو اس کا اطلاق معدوم چیز پر بھی ہو سکتا ہے اگر اس کا وجود فرض کر لیا جائے۔

[نوٹ: ابوالحسنین الخیاط معتزلی کے ماننے والوں کو معدومیہ کہا جاتا ہے' ان کا اعتقاد ہے کہ معدوم بھی ایک شئے ہے اور ہر وہ چیز جس کا علم دیا جا سکے یا اس کی خبر دی جا سکے اسے شئے کہا جائے گا۔ معتزلہ میں سے انہی لوگوں کو خیّاطیّہ یا معدومیہ کہا جاتا ہے۔ یہ دوسرا نام انہیں اس لیے دیا گیا کہ یہ لوگ موجود صفات سے زیادہ معدوم صفات کا تذکرہ کرتے ہیں۔]

ہم خود تو اس بات کے قائل نہیں ہیں لیکن کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس لفظ میں عموم پایا جاتا ہے۔ یہاں جس مخفی چیز کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے وہ دل کا عمل ہے جو اپنی جگہ موجود ہے اور جس میں خیر و شر دونوں داخل ہیں۔

اس کے مقابلے میں سورۃ النساء کی آیت میں ''خیر'' کا لفظ ہے جس کی مناسبت ہم اچھی طرح واضح کر چکے ہیں' اس لیے ہر دو آیت میں جو لفظ وارد ہوا ہے وہ اپنی اپنی جگہ بالکل مناسب ہے اور اس کا عکس کیا جانا ناممکن ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں جوابِ شرط موقع و محل کے مطابق لایا گیا ہے۔ سورۃ الاحزاب میں ﴿اِنْ تُبْدُوْا شَيْئًا اَوْ تُخْفُوْهُ﴾ کے جواب میں کہا گیا: ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ اور سورۃ النساء میں چونکہ ﴿اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ﴾ کا تذکرہ تھا تو جواباً ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا﴾ کہا گیا۔ گویا اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی طرف اشارہ ہو گیا کہ گو وہ انتقام لینے پر قادر ہے' پکڑنے پر آئے تو پکڑ سکتا ہے پھر بھی برائی کرنے والے کو معاف کرتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ فاطر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (آیت ۴۵)

''اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے کیے کرائے پر پکڑنے پر آتا تو زمین کے اوپر کسی جاندار کو نہ چھوڑتا۔''

یہاں ﴿اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ﴾ کہہ کر اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی طرف اشارہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے کو پسند کرتا ہے اور اس عمل پر ثواب عطا کرتا ہے۔

اب یہاں تک تو پہلے دونوں سوالوں کا جواب ہو گیا۔ تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ﴿اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ﴾ کا اضافہ اس آیت کے مضمون کو درجہ کمال تک پہنچا دیتا ہے کہ معاف کرنا اور درگزر کرنا نیکیوں میں ایک اعلیٰ اور ارفع مقام رکھتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو بھی اس بات کا حکم دیا ہے۔ فرمایا:

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ﴾ (المائدۃ:۱۳) ''تو انہیں معاف کرو اور درگزر کرو۔''

اس آیت میں بھی اور کئی دوسری آیات میں بھی یہی حکم دیا گیا ہے۔ اور اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ دونوں آیتوں کا مضمون اپنی اپنی جگہ پوری پوری مناسبت رکھتا ہے۔ واللہ اعلم!

سُورۃُ المَائِدَۃ

(۷۸) آیت ۱:

﴿اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ﴾ ''تمہارے لیے چوپائے مویشی حلال کیے گئے۔''

اور سورۃ الحج کی آیت ۳۰ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ﴾ ''اور تمہارے لیے مویشی حلال کیے گئے۔''

ان دونوں آیات میں اول تو ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے ﴿اُحِلَّتْ لَكُمْ﴾ لیکن سورۃ المائدۃ کی آیت میں ''بَهِيْمَة'' کا اضافہ ہے' جو کہ سورۃ الحج کی آیت میں وارد نہیں ہوا ہے' تو اس کی کیا وجہ ہے؟ جواباً عرض ہے کہ دونوں آیات کا مقصود مختلف ہے اور اس بات کی تفصیل یوں ہے کہ ''الانعام'' کا لفظ سورۃ الانعام کے مطابق آٹھ مویشیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے' جو کہ اس سورت کی آیت ۱۴۳ میں بیان کی گئیں' فرمایا:

﴿ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ﴾

''آٹھ جوڑے، بھیڑ میں دو قسم اور بکری میں دو قسم (یعنی نر اور مادہ)۔''

اور پھر اگلی آیت میں فرمایا:

﴿وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ﴾

''اور اونٹ میں دو قسم اور گائے میں دو قسم۔''

یہ جانور ویسے تو چار ہیں لیکن نر اور مادہ کے اعتبار سے آٹھ ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے قبل آیت میں قد کے اعتبار سے ''حَمُوْلَةً'' (بار برداری والے جانور) اور ''فَرْشًا'' (یعنی زمین سے لگے جانور جیسے بھیڑ بکری) کی تقسیم بھی بتائی گئی۔ اور پھر سورۃ النحل کی آیت ٦٦ میں انہی مویشیوں سے حاصل کردہ دودھ کی نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿٦٦﴾﴾

''اور تمہارے لیے تو چوپایوں میں بھی بڑی عبرت ہے۔ ہم تمہیں وہ خالص اور پینے والوں کے لیے قابلِ ہضم دودھ پلاتے ہیں جو ان کے پیٹ میں ہوتا ہے لیکن وہ گوبر اور خون کے درمیان میں سے نکلتا ہے۔''

یہاں جس دودھ کا بطور نعمت تذکرہ کیا جا رہا ہے، وہ انہی چار مویشیوں سے نکلنے والا دودھ ہے نہ کہ ان جنگلی جانوروں کا، جن کا دودھ اصولاً تو حلال ہے لیکن وہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ گو اَنْعَام کا لفظ جنگلی جانوروں پر بھی صادق آتا ہے لیکن وہ یہاں مراد نہیں ہیں۔ امام ھروی (عبداللہ بن محمد ابو اسماعیل الانصاری، ف ۴۸۱ھ) کہتے ہیں: ''اَنْعَام کا اطلاق اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری پر ہوتا ہے جنہیں آٹھ جوڑوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔''

اب یہ بات بھی علم میں رہنی چاہیے کہ حاجی اگر احرام کی حالت میں ہو تو اس پر جنگلی جانوروں کا شکار حرام ہے۔ فرمایا:

﴿وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ﴾ (المائدۃ:٩٦)

''اور جب تک تم حالت احرام میں ہو تم پر خشکی کا شکار حرام ہے۔''

اب ملاحظہ ہو کہ سورۃ الحج میں حج سے متعلق احکامات بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا:

﴿ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿٢٩﴾﴾

''پھر وہ اپنا میل کچیل دور کریں، اور اپنی نذریں پوری کریں اور اللہ کے قدیم گھر کا طواف کریں۔''

اور پھر حرمت والی چیزوں اور شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم دیا:

﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ﴾ (آیت ٣٠)

''اور جو اللہ کی ٹھہرائی ہوئی مقدس چیزوں کی تعظیم کرے گا تو یہ بات اللہ کے نزدیک اس کے لیے بہتر ہے۔''

اور پھر آخر میں یہ بھی بتا دیا کہ حاجی کے لیے حالت احرام میں کون سا کھانا حلال ہے۔ فرمایا: ﴿وَاُحِلَّتْ لَكُمُ

الْاَنْعَامُ﴾ ''اور تمہارے لیے مویشی حلال کیے گئے''۔اور یہاں ''بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ'' کا تذکرہ مناسب نہیں تھا کہ جس کا ذکر سورۃ المائدۃ میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے:﴿وَاُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ﴾ کیونکہ ''بھیمۃ'' سے جنگلی جانوروں کی طرف اشارہ ہے۔

غزنوی کہتے ہیں: ''بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ وحشی جانوروں کو کہا جاتا ہے۔''

زمخشری نے اس لفظ کی تفسیر میں دو اقوال نقل کیے ہیں۔دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد صرف ہرن' نیل گائے اور اس قبیل کے جانور مراد ہیں۔

سورۃ المائدۃ میں اس لفظ کا خاص طور پر ذکر کیوں آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ المائدۃ آخر میں نازل ہونے والی سورت ہے' اور اس میں کئی احکامات کے بارے میں تکمیلی ہدایات نازل ہوئی ہیں' جیسے احکامات بابت وضو' تیمّم' شکار کی تفصیلات' کھانے پینے کی اشیاء میں حرام چیزوں کا ذکر۔اسی طرح بہت سے دوسرے احکامات بھی نازل ہوئے جو سب کے سب محکم ہیں اور ان میں سے کوئی منسوخ نہیں ہے۔اور پھر اس میں اکمالِ دین کی بھی آیت ہے' فرمایا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ..... ﴾ (آیت ۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا.....''

اور یہی وجہ تھی کہ اس سورت میں ''بھیمۃ الانعام'' یعنی وحشی جانوروں کے حلال ہونے کا بھی ذکر کیا گیا' اور کسی دوسری سورت میں یہ ذکر نہیں آیا' اور اس سورت میں مردار' خون اور لحم خنزیر کی حرمت کا ذکر کرنے کے بعد ان حادثاتی محرمات کا بھی ذکر کیا جن سے وحشی چوپایوں کو زیادہ سابقہ پیش آتا ہے اور اسی لیے ان کا تذکیہ (باقاعدہ ذبح کیا جانا) پالتو جانوروں سے مختلف بھی ہوسکتا ہے۔حادثاتی محرمات سے مراد یہ جانور ہیں:

﴿وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ﴾ (آیت ۳)

''اور وہ جانور جو گلا گھٹ کر' یا چوٹ کھا کر یا اونچی جگہ سے گر کر یا سینگ کی ٹکر سے مرا ہو۔''

یہ دراصل تفصیل ہے اس امر کی جس کی طرف سورۃ المائدۃ کی پہلی ہی آیت میں اشارہ کیا گیا تھا:﴿وَاُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ ''تمہارے لیے وحشی جانور حلال کیے گئے ماسوا ان کے جن کا بیان تم پر کیا جائے گا''۔اسی لیے یہاں حالت احرام میں شکار کے حلال نہ ہونے کا ذکر بھی کر دیا گیا:﴿غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ﴾ ''مگر حالت احرام میں شکار کو حلال مت سمجھنا''۔اور پھر آیت ۹۶ میں صاف صاف حکم دے دیا:﴿وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ﴾ ''اور جب تک تم حالت احرام میں ہو تو تم پر خشکی کا شکار حرام کیا گیا''۔امید ہے کہ اس تفصیل سے واضح ہو گیا ہوگا کہ جو لفظ جہاں آیا ہے وہی مناسب تھا اور اگر اس کا الٹ ہوتا تو قطعاً مناسب نہ ہوتا۔واللہ اعلم!

[نوٹ از مترجم: مصنف نے سورۃ الحج کی آیت ۲۸ کا ذکر نہیں کیا جہاں بھیمۃ الانعام کا ذکر موجود ہے'

اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں ان کا ذکر بطور اَنعام کیا گیا ہے' ان کی حلت کا بیان نہیں ہے۔ فرمایا:
﴿لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ﴾
''(تاکہ وہ حج کے دنوں میں) کچھ فوائد حاصل کریں اور ان مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں ان چوپایوں پر جو اللہ نے انہیں بطور رزق عطا کیے ہیں''۔ یہاں ہر صورت بھیمة سے پالتو جانور ہی مراد لیے جاسکتے ہیں کہ جن کی قربانی کی جاتی ہے۔]

(۷۹) آیت ۲:

﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا﴾
''اور وہ تلاش کرتے ہیں اپنے رب کا فضل اور رضا جوئی۔''

اور سورۃ الفتح کی آیت ۲۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾
''وہ تلاش کرتے ہیں اللہ کی طرف سے فضل اور رضا جوئی''

اور یہی الفاظ سورۃ الحشر کی آیت ۸ کے بھی ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخری دونوں آیات میں ''اللہ کا فضل'' مذکور ہے جبکہ سورۃ المائدۃ میں اس کی نسبت ''ربّ'' کی طرف کی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ (واللہ اعلم) سورۃ المائدۃ کی آیت کی بنیاد تین چیزوں پر رکھی گئی ہے: **تأنیس** (مانوس کرنے کی کوشش)' **تخویف** (ڈرانا) اور **استلطاف** (مہربان ہونے کی طلب) —— ''مِنْ رَّبِّهِمْ'' کہہ کر ان تینوں معانی کا احاطہ مطلوب ہے' جیسا کہ ہم وضاحت کریں گے۔

دیکھئے' اگرچہ پہلی ہی آیت میں چند چیزوں سے منع کیا گیا ہے' اور جب کسی چیز سے منع کیا جاتا ہے تو مخاطب کے دل میں خوف کا پیدا ہونا قدرتی ہے' لیکن خطاب کا آغاز ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' سے کیا گیا ہے جس میں انسیت پائی جاتی ہے۔ اور پھر اس میں مزید انس پیدا ہو جاتا ہے جب انہی اہل ایمان کا یہ وصف بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بیت الحرام کے قصد سے اپنے گھروں سے نکلے ہیں' اور پھر یہ انسیت کمال درجے کو پہنچ جاتی ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے رب سے فضل و رضامندی کے متلاشی ہیں' اور یہ معنی صرف ''مِنَ اللّٰهِ'' کہنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اور یہ بات بھی ملاحظہ ہو کہ قریب ترین شخص سے اگر تکلیف پہنچے تو وہ اس تکلیف سے کہیں بڑھ کر ہے جو کسی دور کے شخص سے پہنچے' بالکل ایسے ہی جیسے زنا کاری ایک برا فعل ہے' کبیرہ گناہ ہے' لیکن پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرنے کی برائی بڑھ جاتی ہے' اور اسی طرح الحاد (نافرمانی کرنا) گناہ ہے لیکن بیت الحرام میں یہ الحاد کئی گنا زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اگر آپ قرآن کی آیات اور احادیث پاک پڑھیں تو اس کی بے شمار مثالیں ملتی جائیں گی۔

اب یہاں دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ''مِنْ رَّبِّهِمْ'' میں جہاں قربت' لطافت اور انسیت کا اظہار ہے وہاں

مخاطب سے کسی ممنوع چیز کے ارتکاب کرنے میں ڈرانے کا عنصر بھی دکھائی دیتا ہے' تو واضح ہو گیا کہ ان آیات میں تأنیس' تخویف اور استلطاف یعنی تینوں بات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یعنی مقصود تھا کہ چند ممنوع چیزوں کے کرنے سے ڈرایا جائے لیکن خطاب میں انسیت اور لطافت پیدا کر کے مخاطب کو ان چیزوں کے کرنے سے روکے جانے پر ابھارا جا رہا ہے۔ لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر یہی اسلوب ایسی جگہ پر ہو جہاں نہ ہی انسیت مراد ہو اور نہ ہی اظہار لطف و کرم تو پھر اس کا کیا جواب ہوگا؟ جیسے یہ آیت:

﴿وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۶﴾ (الملك)

''اور جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا تو ان کے لیے عذاب جہنم ہے' اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔''

جواباً عرض ہے کہ سورۃ الفتح اور سورۃ الحشر کی آیات میں صرف مدح ہی مدح ہے' وہاں کسی ڈراوے کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی انسیت پیدا کرنے کا کوئی سبب موجود ہے جیسا کہ سورۃ المائدۃ کی آیت میں پایا جاتا ہے۔

ملاحظہ کریں کہ سورۃ الفتح کی آیت میں وہ لوگ مذکور ہیں جو اس امت کے جلیل القدر اور عظیم الشان لوگوں میں سے ہیں' اور ان کی خصوصیات کی بنا پر ان کی تعریف اور توصیف ہی مناسب تھی' اور یہی کیفیت سورۃ الحشر کی آیت کی ہے کہ وہاں بھی مہاجرین اور انصار کا ذکر ہے' ان کے اچھے اوصاف کو بیان کیا گیا ہے اور سورۃ المائدۃ کی آیت کے برعکس وہاں کسی منفی صفت کا تذکرہ نہیں ہے کہ جس کی بنا پر عذاب سے ڈرانے کا بھی ذکر ہوتا۔ فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۸﴾ (الحشر)

''اور (مالِ فے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور ممتلکات سے نکالے گئے اور وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلب گار تھے' اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے تھے' اور وہ لوگ راست باز تھے۔''

[نوٹ: مصنف نے چند سطور قبل جو سوال اٹھایا تھا' غالباً اس کا جواب دینا بھول گئے' اس لیے کتاب کے حاشیے پر بھی یہ بات درج ہے: **لعله بقي هنا كلام** ''شاید یہاں کچھ کلام ابھی بھی باقی ہے''۔ مترجم کتاب مصنف کے منہج کی روشنی میں سورۃ الملک کی مذکورہ آیت کی توجیہہ یوں کر سکتا ہے کہ سورۃ الملک کے آغاز ہی سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے مظاہر کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ جیسے اللہ کی بادشاہت' موت و حیات کا خالق ہونا' سات آسمانوں کا بے عیب بنانا' آسمان کو ستاروں سے مزین کرنا وغیرہ۔ اور پھر اس کے بعد دو گروہوں کا تذکرہ ہے' ایک وہ جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا' اور ان کا تذکرہ ان الفاظ کے ساتھ کیا: ﴿وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۶﴾ (الملك) اور پھر ان کے انجام کے ذکر کے بعد اہل ایمان کا تذکرہ کیا اور وہ بھی ''رب'' کے ذکر کے ساتھ۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۲﴾ (الملك) ''اور جو لوگ اپنے رب سے حالت غیب میں ڈرتے ہیں ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے''۔ گویا یہاں دو گروہوں کا تقابل ہے' ایک وہ جس نے اللہ کے آثارِ ربوبیت کو دیکھنے کے باوجود اس کا انکار

کیا اور دوسرا وہ جو اس امتحان میں پورا اترا تو اجرِ عظیم کا مستحق ٹھہرا' واللہ اعلم!]

(۸۰) آیت ۲:

﴿وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا﴾

''اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کرو' اس لیے کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا۔''

اور آیت ۸ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ﴾

''اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں انصاف کرنے سے نہ روکے۔''

دونوں آیتوں میں اچھے اخلاق پر ابھارا گیا ہے۔ اہل مکہ کی طرف سے حدیبیہ کے سال اصحابِ رسول ﷺ کو عمرے سے منع کیا جانا' مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکنا' یہ وہ جرائم تھے جن کی بنا پر ان سے نفرت کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا' اس لیے فتح مکہ کے بعد اہل ایمان کو وصیت کی جا رہی ہے کہ وہ انتقام کا رویہ نہ اپنائیں بلکہ عفو و درگزر سے کام لیں' جو لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں انہیں گلے لگائیں اور ان پر کسی قسم کی زیادتی نہ کریں۔ اب دونوں آیات کا موضوع ایک ہی ہے لیکن پہلی آیت میں ''اَنْ تَعْتَدُوْا'' کے الفاظ ہیں اور دوسری آیت میں ''عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا'' کے الفاظ ہیں' اور ظاہر ہے کہ زیادتی کرنا' عدل نہ کرنے سے کہیں بڑھ کر ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواباً عرض ہے کہ (واللہ اعلم) پہلی آیت میں اس سبب کا صراحتاً بیان ہوا ہے جو ایک شخص کو زیادتی کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے' یعنی یہ کہ کفارِ مکہ نے حدیبیہ کے سال انہیں بیت اللہ میں داخل ہونے سے روکا تھا' اور یہاں چونکہ نفرت و عداوت کے سبب کا صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے اس لیے مناسب تھا کہ انہیں یہ وصیت کی جاتی کہ گو برائی کا بدلہ برائی سے دینا جائز ہے لیکن ایمان کا اعلیٰ درجہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ انتقام کی راہ نہ اپنائیں' کسی بھی زیادتی کا خیال دل میں نہ لائیں۔ اس کے مقابلے میں دوسری آیت سے پہلے ایسے کسی جرم کا ذکر نہیں ہے' بلکہ وہاں تو اس آیت سے قبل عدل پر قائم رہنے اور اللہ کے لیے گواہی دینے کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾

''اے ایمان والو! اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ۔''

اب یہاں جب عدل و انصاف کا حکم دیا جا رہا ہے تو مناسب یہی تھا کہ یوں کہا جاتا کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں عدل نہ کرنے پر نہ اُبھارے۔ اور یوں واضح ہو گیا کہ ہر دو الفاظ اپنی اپنی جگہ پر بالکل مناسب ہیں' اور اگر اس کا الٹ ہوتا تو مناسب نہ ہوتا' واللہ اعلم!

❁❁❁

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ الاعراف

آیات ۱۷۵ تا ۱۷۸

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلًا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾﴾

س ل خ

سَلَخَ يَسْلَخُ (ف) سَلْخًا : کسی چیز کی کھال کھینچنا' کسی چیز میں سے کسی چیز کو کھینچ کر نکالنا۔ ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ﴾ (یٰسٓ:۳۷) ''اور ایک نشانی ان کے لیے رات ہے' ہم کھینچ لیتے ہیں اس سے دن کو۔''

اِنْسَلَخَ يَنْسَلِخُ (انفعال) اِنْسِلَاخًا: (۱) کسی کا کسی چیز سے نکل جانا' سٹک جانا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۷۵۔ (۲) کسی چیز کا گزر جانا۔ ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ﴾ (التوبۃ:۵) ''پھر جب گزر جائیں محترم مہینے۔''

ل ھ ث

لَهِثَ يَلْهَثُ (س) لَهْثًا : پیاس یا تھکان کی وجہ سے ہانپ کر زبان نکالنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۷۶

ترجمہ:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ: اور آپؐ پڑھ کر سنائیں ان کو نَبَاَ الَّذِيْ: اس کی خبر

اٰتَيْنٰهُ : ہم نے دیں جس کو
فَانْسَلَخَ : پھر وہ سٹک گیا
فَاَتْبَعَهُ : پھر پیچھے لگا اس کے
فَكَانَ : تو وہ ہو گیا
وَلَوْ : اور اگر
لَرَفَعْنٰهُ : تو ہم ضرور بلند کرتے اس کو
وَلٰكِنَّهٗٓ : اور لیکن
اِلَى الْاَرْضِ : زمین کی طرف
هَوٰىهُ : اپنی خواہش کی
كَمَثَلِ الْكَلْبِ : کتے کی مثال کی مانند ہے
تَحْمِلْ : تو بوجھ ڈالے
يَلْهَثْ : تو وہ ہانپے گا
تَتْرُكْهُ : اگر تو چھوڑ دے اس کو
ذٰلِكَ : یہ
كَذَّبُوْا : جھٹلایا
فَاقْصُصِ : پس آپؐ بیان کریں
لَعَلَّهُمْ : شاید وہ لوگ
سَآءَ : کتنی بری ہے
الْقَوْمُ الَّذِيْنَ : اُس قوم کی جس نے
بِاٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو
كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ : وہ لوگ ظلم کرتے تھے
يَّهْدِ : ہدایت دے
فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ : تو وہ ہی ہدایت پانے والا ہے
يُّضْلِلْ : وہ گمراہ کرے
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ : ہی خسارہ پانے والے ہیں

اٰيٰتِنَا : اپنی نشانیاں
مِنْهَا : ان سے
الشَّيْطٰنُ : شیطان
مِنَ الْغٰوِيْنَ : گمراہوں میں سے
شِئْنَا : ہم چاہتے
بِهَا : ان سے (یعنی آیات کے علم سے)
اَخْلَدَ : وہ ہمیشہ کے لیے مائل ہوا
وَاتَّبَعَ : اور اس نے پیروی کی
فَمَثَلُهٗ : تو اس کی مثال
اِنْ : اگر
عَلَيْهِ : اس پر
اَوْ : یا
يَلْهَثْ : تو (بھی) وہ ہانپے گا
مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ : ان لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے
بِاٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو
الْقَصَصَ : اس قصے کو
يَتَفَكَّرُوْنَ : غور و فکر کریں
مَثَلًا : مثال
كَذَّبُوْا : جھٹلایا
وَاَنْفُسَهُمْ : اور اپنے آپ پر (ہی)
مَنْ : جس کو
اللّٰهُ : اللہ
وَمَنْ : اور جس کو
فَاُولٰٓئِكَ : تو وہ لوگ

نوٹ: آیت ۱۷۵ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لیکن نہ تو قرآن مجید میں اور نہ ہی کسی حدیث میں یہ بتایا گیا کہ وہ شخص کون تھا۔ مفسرین نے مختلف نام لیے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ

وہ خاص شخص تو پردہ میں ہے' البتہ یہ مثال ہر اُس شخص پر چسپاں ہوتی ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں (تفہیم القرآن)۔اس لیے کسی شخص کو تلاش کرنے کے بجائے ہمیں اس کردار کو پہچاننے اور اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے' کیونکہ یہ کردار ہر معاشرے اور ہر دور میں پایا جاتا ہے۔اس پہلو سے جب ہم آیات زیر مطالعہ پر غور کرتے ہیں تو مذکورہ کردار کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

اللہ تعالیٰ کا کسی انسان کو آیات دینے کا مطلب ہے نشانیوں کا علم عطا کرنا' جن کی مدد سے انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتا ہے اور جس کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی جستجو کرے اور اس کی ناراضگی سے بچنے کی سعی کرے۔کوئی شخص اگر اس تقاضے کو پورا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی شخصیت اور کردار کو بلندی عطا کرتا ہے' لیکن جو اس تقاضے کو پورا نہیں کرتا اور اپنی خواہشات کو ہی ترجیح دیتا ہے تو گویا وہ اپنے علم اور معرفت کے دائرے سے نکل گیا۔اسی کو فَانْسَلَخَ کہا گیا ہے' اور اس رویہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ کے لیے زمین ہی کی طرف مائل ہو جائے' یعنی دنیا کے ساز و سامان اور عیش و آرام کی ہی جستجو کرتا رہے۔ایسے شخص کو کتے کی مانند کہا گیا ہے' کیونکہ کتے کے نظامِ تنفّس کی یہ خصوصیت ہے کہ جب وہ تازہ ہوا اندر کھینچتا ہے تو اس میں موجود آکسیجن سے اسے تسکین نہیں ہوتی۔اس لیے وہ جلدی سے ہوا باہر نکال کر دوبارہ تازہ ہوا کھینچتا ہے۔اس عمل کے تسلسل سے اس پر ہانپنے کی کیفیت طاری رہتی ہے۔اسی طرح جب کوئی شخص دنیا کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے تو اسے دنیاوی ساز و سامان سے تسکین حاصل نہیں ہوتی' بلکہ وہ هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ کی ہوس میں گرفتار ہو کر ہر وقت ہانپنے کی کیفیت کا شکار رہتا ہے۔

دنیا کا ہی ہو رہنے یعنی اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ میں اصل خرابی کا ذہن میں واضح ہونا ضروری ہے' کیونکہ اسلام تارک الدنیا ہونے سے منع کرتا ہے اور اس کے برعکس دنیاوی ساز و سامان کو استعمال کرنے کی تاکید کرتا ہے۔مثلاً الحدید:۲۷' الاعراف:۳۱ تا ۳۳' الملک:۱۵ وغیرہ۔حقیقت یہ ہے کہ گنتی کی چند حرام چیزوں کو چھوڑ کر باقی اشیاء نہ تو بذاتِ خود بری ہیں اور نہ ان کے استعمال میں کوئی برائی ہے۔برائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کو زندگی کے ذریعہ کے طور پر استعمال کرنے کی بجائے ہم ان کو زندگی کا مقصد بنا بیٹھتے ہیں۔اس بات کی اہمیت کے پیش نظر اسے مزید سمجھ لیں۔

کھانا پینا' سونا جاگنا' بچے پیدا کرنا اور پھر مر جانا' یہ وہ سطح ہے جس پر جانور زندگی بسر کرتے ہیں۔انسانوں کے لیے زندگی گزارنے کا یہ انداز انسانیت کی توہین ہے۔عقل و فہم کی صلاحیتوں کی بنیاد پر انسان کو اشرف المخلوقات کا رتبہ ملا ہے' اس کا تقاضا ہے کہ انسان کسی نصب العین کو اپنا مقصدِ زندگی بنائے اور دنیا کے ساز و سامان کو اس کے حصول کا ذریعہ بنائے۔بلند ترین نصب العین یہ ہے کہ انسان اپنے حاجت روا' مشکل کشا اور روزی رساں کو پہچانے اور اس کی رضا و خوشنودی کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے زندگی کو برقرار رکھنا اور جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا انسان کی ضرورت ہے۔اس ضرورت کو پورا کرنے کی

غرض سے جب وہ دنیا کی اشیاء کو استعمال کرتا ہے تو ان میں غذا کی تاثیر ہوتی ہے' یعنی ان کے استعمال سے تسکین بھی حاصل ہوتی ہے اور صلاحیتیں بھی پروان چڑھتی ہیں۔ آیت ۱۷۶ میں اسی حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی کی گئی ہے۔ لیکن جب انسان ذرائع زندگی کو ہی اپنا مقصد زندگی بنا بیٹھتا ہے تو پھر انہی اشیاء میں نشہ کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے' یعنی ان کے استعمال سے نہ تو تسکین حاصل ہوتی ہے اور نہ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں' بلکہ ان میں انحطاط کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس بات کو یوں سمجھیں کہ انگور ایک خوش ذائقہ اور صحت بخش غذا ہے' لیکن یہی انگور جب گل سڑ جاتا ہے تو اس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے' یعنی نہ اس میں تسکین رہتی ہے اور نہ یہ صحت بخش رہتا ہے۔ یہی مثال دنیا کے باقی ساز و سامان کی ہے۔

بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ دنیا کو مقصدِ زندگی بنانے والوں کی صلاحیتیں تو خوب پروان چڑھتی ہیں اور یہ لوگ دنیا میں تو بڑے کامیاب ہوتے ہیں' لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بلڈ پریشر' شوگر' ہارٹ بائی پاس' اعصابی امراض اور نفسیاتی پیچیدگیوں وغیرہ کے امراض میں مبتلا ہونے والوں کی غالب اکثریت ایسے ہی کامیاب لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ پھر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ایسے لوگوں کے جسمانی انحطاط کا آغاز تو بہت پہلے ہو جاتا ہے' البتہ اس کا نتیجہ ظاہر ہونے میں ایک وقفہ حائل ہوتا ہے۔ ان کے ذہنی انحطاط کی علامت یہ ہے کہ آج کے ماہرین انسانوں کے کسی مسئلہ کو جب حل کرتے ہیں تو اس سے نئے مسائل جنم لیتے ہیں۔ پھر ان کے حل سے مزید مسائل وجود میں آتے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جس پر کُتّے کے نظامِ تنفّس کی مثال پوری طرح چسپاں ہوتی ہے۔ اور ان کے کردار کے انحطاط پر بات کرنا حدادب ہے۔

آج اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ یعنی حُبِّ دُنیا نے انسانوں کی اکثریت کو تسکین سے محرومی اور ھَلْ مِنْ مَّزِیْد کی ہوس میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس مشاہدے نے معاشیات کے اس اصول کو جنم دیا ہے کہ Human wants are insatiable (انسانی ضروریات قابل تسکین نہیں ہیں)۔ ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ ایک انسانی ضرورت پوری ہوتی ہے تو کوئی دوسری ضرورت جنم لے لیتی ہے اور یہ ایک سلسلۂ لامتناہی ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اصول میں لفظ Wants دو دھاری تلوار ہے۔ ایک طرف تو اس کا اطلاق Human Needs (انسانی ضروریات) پر ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ Human Desires (انسانی خواہشات) پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اس وجہ سے انسانی ضروریات اور خواہشات آپس میں گڈمڈ ہو کر ایک ہی چیز نظر آنے لگتی ہیں' جبکہ یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ اس لیے لفظ Wants کو نکال کر اگر یہی اصول اس طرح بیان کیا جائے کہ ''انسانی خواہشات قابل تسکین نہیں ہیں'' تو یہ بات درست ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ انسانی ضروریات قابل تسکین نہیں ہیں تو یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک لفظ Wants نے کیا قیامت ڈھائی ہے اور انسانوں کو کیسی سنگین غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے' جس کی وجہ سے آج انسانیت کیسے کیسے دکھ جھیل رہی ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ یعنی حُبِّ دنیا کی حقیقت کو پہچاننے اور اس

سے بچنے کے لیے شعوری طور پر اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے' کیونکہ اس کا انجام بڑا حسرتناک ہے۔ایک مقولے میں تھوڑی سی ترمیم کر کے اس کی حقیقت کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے:

Hubb-e-Dunya is just like a cigarette,
which burns with flame and ends in ashes.

آیات ۱۷۹ تا ۱۸۶

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ ۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾﴾

ل ح د

لَحَدَ يَلْحَدُ (ف) لَحْدًا: (۱) بغلی قبر کھودنا' کسی طرف مائل ہونا۔ (۲) عقیدے یا مذہب سے پھر جانا۔

اَلْحَدَ يُلْحِدُ (افعال) اِلْحَادًا: عقیدے یا مذہب میں شک پیدا کرنا' کجروی کرنا' جھگڑنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۸۰۔

اِلْتَحَدَ يَلْتَحِدُ (افتعال) اِلْتِحَادًا: اہتمام سے کسی طرف مائل ہونا۔

مُلْتَحَدٌ (اسم المفعول' جو اسم ظرف کے طور پر آتا ہے): پناہ گاہ۔

م ت ن

مَتُنَ يَمْتُنُ (ک) مَتَانَةً: مضبوط وقوی ہونا۔

مَتِيْنٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت): پختہ' مضبوط۔ زیر مطالعہ آیت ۱۸۳۔

ترجمہ:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا: اور بے شک ہم نے پیدا کیا ہے
كَثِيْرًا: بہتوں کو
لَهُمْ: ان کے لیے
لِجَهَنَّمَ: جہنم کے لیے
مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ: انسانوں اور جنوں میں سے
قُلُوْبٌ: دل ہیں

لَّا يَفْقَهُوْنَ :(لیکن) وہ لوگ علم کا احاطہ نہیں کرتے ہیں

وَلَهُمْ :اوران کے لیے

لَّا يُبْصِرُوْنَ :(لیکن) وہ لوگ دیکھ کر سمجھتے نہیں ہیں

وَلَهُمْ :اوران کے لیے

لَّا يَسْمَعُوْنَ :(لیکن) وہ لوگ سن کر سمجھتے نہیں ہیں

اُولٰٓئِكَ :وہ لوگ

بَلْ :بلکہ

اَضَلُّ :زیادہ گمراہ ہیں

هُمُ الْغٰفِلُوْنَ :ہی غفلت برتنے والے ہیں

الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى :تمام خوبصورت نام

بِهَا :ان سے

الَّذِيْنَ :ان کو جو

فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ :اس کے ناموں میں

مَا :اس کا جو

وَمِمَّنْ :اوران میں سے جن کو

اُمَّةٌ : کچھ ایسے لوگ ہیں

بِالْحَقِّ :حق کی

يَعْدِلُوْنَ :وہ عدل کرتے ہیں

كَذَّبُوْا :جھٹلایا

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ : ہم بتدریج لے جائیں گے ان کو

لَا يَعْلَمُوْنَ :وہ لوگ نہیں جانتے (جس کو)

لَهُمْ :ان کو

كَيْدِيْ :میری تدبیر

اَوَ :کیا

اَعْيُنٌ :آنکھیں ہیں

بِهَا :ان سے

اٰذَانٌ :کان ہیں

بِهَا :ان سے

كَالْاَنْعَامِ :مویشیوں کی مانند ہیں

هُمْ :وہ لوگ

اُولٰٓئِكَ :یہ لوگ

وَلِلّٰهِ :اوراللہ کے لیے ہی ہیں

فَادْعُوْهُ :توتم پکارواُس کو

وَذَرُوْا :اورچھوڑ دو

يُلْحِدُوْنَ : کجروی اختیار کرتے ہیں

سَيُجْزَوْنَ :ان کو بدلہ دیا جائے گا

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ :وہ لوگ کرتے تھے

خَلَقْنَآ :ہم نے پیدا کیا

يَّهْدُوْنَ :جو ہدایت دیتے ہیں

وَبِهٖ :اوراسی سے

وَالَّذِيْنَ :اورجنہوں نے

بِاٰيٰتِنَا :ہماری نشانیوں کو

مِّنْ حَيْثُ :وہاں سے

وَاُمْلِيْ :اورمیں ڈھیل دیتا ہوں

اِنَّ :بے شک

مَتِيْنٌ :پختہ ہے

لَمْ يَتَفَكَّرُوْا :انہوں نے غور نہیں کیا

مَا : (کہ) نہیں ہے
مِّنْ جِنَّةٍ : کسی قسم کا کوئی جنون
هُوَ : وہ
نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ : ایک واضح خبردار کرنے والا
لَمْ يَنْظُرُوْا : انہوں نے نظر نہیں ڈالی
وَمَا : اور اس میں جو
اللّٰهُ : اللہ نے
وَّاَنْ : اور یہ کہ
اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ : کہ قریب آ چکا ہو
فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ : تو کون سی بات پر
يُؤْمِنُوْنَ : وہ لوگ ایمان لائیں گے
يُّضْلِلِ : گمراہ کرے
فَلَا هَادِيَ : تو کوئی بھی ہدایت دینے والا نہیں ہے
وَيَذَرُهُمْ : اور وہ چھوڑ دیتا ہے ان کو
يَعْمَهُوْنَ : بھٹکتے ہوئے

بِصَاحِبِهِمْ : ان کے ساتھی کو
اِنْ : نہیں ہے
اِلَّا : مگر
اَوَ : کیا
فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں
خَلَقَ : پیدا کیا
مِنْ شَيْءٍ : کسی چیز سے
عَسٰٓى : ہو سکتا ہے
اَجَلُهُمْ : ان کے خاتمے کا وقت
بَعْدَهٗ : اس کے بعد
مَنْ : جس کو
اللّٰهُ : اللہ
لَهٗ : اس کے لیے
فِيْ طُغْيَانِهِمْ : ان کی سرکشی میں

نوٹ ۱: آیت ۱۷۹ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کن کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے؟ اس کا جواب آگے دے دیا ہے کہ ان لوگوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے جو اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کریں گے۔ اور دنیا کے کمرۂ امتحان میں چونکہ اللہ نے انسان کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو جس مقصد کے لیے چاہے استعمال کرے، جو عقیدہ اور نظریہ چاہے اختیار کرے اور جیسا چاہے عمل کرے، اس لیے یہ بات ہر انسان کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ چاہے تو اپنا نام پاس ہونے والوں یعنی جنت میں جانے والوں میں لکھوائے اور چاہے تو فیل ہونے والوں یعنی جہنم میں جانے والوں میں لکھوائے۔ انسان کے اس اختیار کو نہ تو اللہ تعالیٰ خود سلب کرتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو اس کی اجازت دیتا ہے۔ اسی لیے فرما دیا کہ ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ﴾ (البقرۃ:۲۵۶) (ضابطۂ حیات کے ضمن میں کسی قسم کا کوئی جبر نہیں ہے)۔ دوسرے الفاظ میں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ضابطۂ حیات کے ضمن میں انسان کو مکمل اختیار حاصل ہے۔

نوٹ ۲: البقرۃ: ۷ کے نوٹ ۳ میں ہم سماعت اور بصارت کی وضاحت کر چکے ہیں، لیکن مناسب ہے کہ اس

مقام پر ہم اس بات کو ذرا وضاحت سے سمجھ لیں' کیونکہ آیت ۱۷۹ میں اُس process کی نشاندہی کی گئی ہے جس سے گزر کر انسان فیصلہ کرتا ہے اور اپنے اختیار کو استعمال کرتا ہے۔ مذکورہ نوٹ ۳ میں ہم سمجھ چکے ہیں کہ جب آنکھ اپنی حاصل کردہ معلومات کو ذہن تک پہنچاتی ہے تو اس کی اس صلاحیت کو بصارت کہتے ہیں۔ اسی طرح جب کان اپنی حاصل کردہ معلومات کو ذہن تک پہنچاتا ہے تو اس کی یہ صلاحیت سماعت کہلاتی ہے۔ اب سمجھنے والی بات یہ ہے کہ آیت زیر مطالعہ میں بصارت اور سماعت کا ذکر کس حوالہ سے کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات پھر یاد کر لیں کہ قرآن مجید کا یہ ایک خاص انداز ہے کہ کبھی وہ کسی چیز کے جزء کی طرف اشارہ کر کے پوری چیز مراد لیتا ہے۔ (ملاحظہ ہو: البقرۃ:۱۱۲' نوٹ ۱) اس بات کو ذہن میں رکھ کر مذکورہ آیت پر غور کریں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہاں دراصل ہمارے حواسِ خمسہ اور ان کی ذہن تک معلومات پہنچانے کی صلاحیت کی بات ہو رہی ہے۔ پھر انسانی ذہن حاصل شدہ معلومات کو ذخیرہ (store) کرنے سے پہلے ان کا تجزیہ کر کے کوئی فیصلہ کرتا ہے' جسے ہم عقل کہتے ہیں۔ اس طرح یہاں بصارت اور سماعت کے ذکر میں عقل کا استعمال از خود شامل ہے۔

عقل کے ضمن میں قرآن مجید کے طالب علم اور جدید تعلیم یافتہ افراد کے نکتہ نظر میں فرق ہے۔ کیونکہ کچھ عرصہ پہلے تک ماہرین نفسیات کا کہنا تھا کہ حاصل شدہ معلومات سے ذہن کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے اور انسانی جسم میں موجود موٹر سنٹر کو حکم دیتا ہے' تو انسان کا عمل اس کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات ہمارے علم میں آتی ہے کہ ذہن کے فیصلے اور عمل کے درمیان میں ایک مرحلہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ذہن کے فیصلے کو انسان کا دل یا تو قبول کرتا ہے یا رد کرتا ہے۔ پھر انسان کا عمل عقل کے نہیں بلکہ اس کے دل کے فیصلے کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ بات تو ٹھیک ہے' پر کیا کریں دل نہیں مانتا۔ یعنی ذہن اس بات کو قبول کر رہا ہے اور اس کا فیصلہ ہے کہ یہ کام کیا جائے لیکن دل قبول نہیں کر رہا ہے' اس لیے میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس جب کسی بات پر ہمارا دل ٹھک جاتا ہے تو وہ کام ہم کتنے شوق اور لگن سے کرتے ہیں' یہ بات سب لوگ خوب جانتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آخر میں فیصلہ دل کا ہوتا ہے۔ اور اب تو ماہرین نے بھی اپنی اصلاح کر لی ہے۔ جدید مینجمنٹ سائنس کا اصول یہ ہے کہ عمل کے لیے تنہا conviction (ذہن کا قائل ہونا) کافی نہیں ہے' بلکہ اس کے ساتھ motivation (شوق اور لگن) کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اب یہ بات بہت واضح ہے کہ motivation کا تعلق عقل سے نہیں ہے' بلکہ جذبہ سے ہے' جس کا مقام دل ہے' اور دل کے فیصلہ کرنے کو قرآن تفقّہ کہتا ہے۔ اسی لیے آیت زیر مطالعہ میں فرمایا کہ ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے تفقّہ نہیں کرتے۔

اب سوال یہ ہے کہ عقل کا فیصلہ تو حواسِ خمسہ کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر ہوتا ہے' لیکن دل کے فیصلے کی بنیاد کیا ہے؟ تو یہ بات نوٹ کر لیں کہ دل کا فیصلہ ان ''معلومات'' کی بنیاد پر ہوتا ہے جنہیں انسان کی فطرت میں ڈال کر اسے کمرۂ امتحان میں بھیجا جاتا ہے' جس میں سرفہرست اللہ تعالیٰ کی معرفت اور نیکی و بدی کا شعور ہے اور جس کی وضاحت آیت الاعراف:۱۷۲ کے نوٹ ۱ میں کی جا چکی ہے۔ (باقی صفحہ 79 پر)

کتابتِ مصاحف اور علم الرسم

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

(۱) ''الجمع الصوتی الاول للقرآن'' کے مؤلف ڈاکٹر لبیب السعید نے اپنی کتاب کی تمہید میں علامہ عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن کے دیباچہ سے یہ عبارت (بصورتِ ترجمہ) نقل کی ہے:

''لیس فی الدنیا کتاب وضعت فی خدمته مثل هذه الکثرة من المواهب التی وضعت فی خدمة القرآن ولا مثل هذه الوفرة من العمل والوقت والمال'' (۱)

اصل انگریزی عبارت یوں ہے:

There is no book in the world in whose service so much talent, so much labour, so much time and money have been expended as has been the case with the Quran. (2)

خدمت قرآن کے بیسیوں میدان اور مطالعہ قرآن کے سینکڑوں عنوان ہیں۔ اور قرآن کریم سے متعلق یہ ''علمی میدان'' اور ''علمی عنوان'' متعدد تحریکات اور سینکڑوں تالیفات کو وجود میں لائے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم اور بنیادی میدان ہے النّص القرآنی (کلمات قرآن) کی (مصحف میں) (۳) کتابت۔ اور اسی (کتابت مصحف) کے قواعد وضوابط کے بیان کا علمی عنوان ہے ''علم الرسم'' اور اس علم کا مختصر سا تعارف ہی اس مقالہ کا موضوع ہے۔

(۲) عربی زبان میں ''لکھائی'' کے لیے متعدد (قریباً) ہم معنی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً الکتابة' الخط' الزبر' السطر' الرقم' الرشم (بالشین)' الرسم اور الهجاء وغیرہ (۴)۔ ان میں سے قرآن کریم کی کتابت کے ضمن میں لفظ ''خط'' سے عموماً خطاطی اور خوشنویسی کا بیان اور اس کی تاریخ مراد لی جاتی ہے۔ اور یہ خطاط اور مؤرخِ خط کا میدان ہے۔ اور ''الهجاء'' اور ''الرسم'' (اور اس کے مشتقات) اور ان پر مبنی بعض تراکیب' املاء قرآن (۵) کے اصول وقواعد کے معنوں میں ایک علم اور فن کا اصطلاحی نام بن چکے ہیں۔

گزشتہ چودہ صدیوں میں اس علم کے نام کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً ابتدا میں تو کتابت یا خط کے لفظ ہی سامنے آئے (۶) پھر آگے چل کر مختلف اسباب وعوامل کی بنا پر اس کے لیے ''هجاء'' کا استعمال شروع ہوا۔ مثلاً ''هجاء المَصاحف''، ''هجاء مصاحف الامصار''، ''هجاء التنزیل'' وغیرہ۔ لفظ ''الهجاء'' کے لفظی معنی ہیں: حرفوں (کے ناموں) کی ابتدائی آوازوں سے لفظ بنانا۔ مثلاً بکر کا ھجاء ''ب ك ر'' ہے۔ اس طرح هجاء المصاحف کا مطلب ہوا: قرآن کے لفظوں کو لکھنے کے لیے ان کے حرفوں کو ترتیب وار گن کر باہم جوڑنے کا طریقہ یا اس کے قواعد۔

قریباً پانچویں صدی ہجری سے لفظ ''الرسم''اور''مرسوم'' کا استعمال شروع ہوا' مثلاً ''رسم المصحف''، ''رسم مصاحف الامصار''، ''مرسوم المصاحف''، ''رسم القرآن''، ''مرسوم خط التنزیل'' وغیرہ۔ابن خلدون (ت۸۰۸ھ) نے اسے فن الرسم اور الرسم المصحفی لکھا ہے(۷)۔ قلقشندی نے اسے المصطلح الرسمی اور الاصطلاح السلفی کہا ہے۔(۸)

گیارہویں بارہویں صدی ہجری سے ''رسم'' کے ساتھ (ترکیب میں) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا ان کی طرف منسوب مصاحف کا نام زیادہ استعمال ہونے لگا' مثلاً ''رسم المصاحف العثمانیة''، ''رسوم مصاحف عثمان''، ''رسم المصحف الامام''اور''الرسم العثمانی'' وغیرہ۔آج کل اس کے لیے جامع اصطلاح ''علم الرسم''یا صرف''الرسم ''اختیار کی جاتی ہے۔اس لفظ کے علی الاطلاق استعمال کی صورت میں یعنی کسی توصیفی یا اضافی ترکیب کے بغیر بھی اس سے مراد''رسم المصحف''ہی ہوتا ہے۔اردو میں اس کے لیے''رسمِ قرآن''، ''قرآنی رسم الخط''یا ''رسم عثمانی'' (۹) کے الفاظ اور فارسی میں ''املاء قرآن''اور بعض دفعہ''رسمِ مصحف'' کی اصطلاح کا رواج ہے۔

الرسم کے لفظی معنی ہیں: اثر یا نشان' اور اس کی جمع رسوم (آثار' نشانات) آتی ہے۔غالباً قرآن کریم کی کتابت کے آداب وقواعد کے لیے اس لفظ کے مختص ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں عہدِ نبوی اور عہدِ راشدین کی کتابت اور طریقِ املاء کو ایک یادگار کے طور پر محفوظ کر لینے کا تصور شامل ہو گیا ہے۔اسی تاریخی پہلو کی طرف اشارہ کے لیے''علم الرسم'' کی تعریف ہی''الخط المرسوم فی المصاحف العثمانیة'' سے کی جاتی ہے(۱۰) اور اسے رسم عثمانی کہنے کی بنیاد بھی تاریخی ہے۔

چونکہ املاء قرآن بعض باتوں میں عام عربی املاء سے مختلف ہے' اس لیے دونوں کا فرق واضح کرنے کے لیے بعض دفعہ عام املاء کے لیے بھی ''رسم'' کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے مگر ترکیب کے ساتھ۔مثلاً [الرسم القرآنی یا الرسم الاصطلاحی کے مقابلے پر] الرسم الاملائی' الرسم القیاسی یا الرسم المعتاد کہہ لیتے ہیں(۱۱)۔اوران دونوں کے باہمی فرق اور اختلاف کی وجہ سے علم الرسم کی منطقی حد (تعریف) یوں بیان کی جاتی ہے''هو علم تعرف به مخالفات خط المصاحف العثمانية لاصول الرسم القياسی''(۱۲) (علم الرسم وہ علم ہے جس کے ذریعے مصاحف عثمانیہ کی املاء میں رسم قیاسی کی مخالفت اور اختلافات کا پتا چلتا ہے)۔

(۳) علم الرسم کی مندرجہ بالا تعریف اور تعارف سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا تعلق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے مصاحف سے ہے' اور یہی وجہ ہے کہ علم الرسم کی تمام کتابوں میں سب سے پہلے جمع وتدوین قرآن کے تین معروف مراحل یعنی عہدِ نبوی' عہدِ صدیقی اور عہدِ عثمانی میں اس عمل کے دواعی اور اس کی کیفیت سے بحث کی جاتی ہے۔قرآن کریم کے اس عثمانی ایڈیشن یعنی مصاحفِ عثمانیہ کی تیاری ایک معروف واقعہ ہے۔یہاں اس کی تفصیلات میں جانا باعث طوالت ہوگا' نیز اس وقت ہمارا اصل مرکزی موضوع بھی یہ نہیں ہے۔تاہم چونکہ ''علم

الرسم'' کی بنیاد یہی مصاحف عثمانیہ بنے' اس لیے اصل موضوع (الرسم) کی مناسبت سے ان مصاحف کے بارے میں چند امور قابل ذکر ہیں:

۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت محرم ۲۴ھ تا ذی الحجہ ۳۵ھ یعنی بارہ سال ہے۔ اس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ مصاحف کی تیاری والا کام کب شروع ہوا اور کب اختتام کو پہنچا؟ اس بارے میں مختلف روایات ہیں۔ تاریخی بحث کی تفصیل میں گئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام ۲۵ھ تا ۳۰ھ کی درمیانی مدت میں ہی مکمل ہو گیا تھا(۱۳)۔ گویا یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ۱۵ تا ۲۰ سال کے اندر اندر اور غارِ حرا میں پہلی وحی کے نزول سے پچاس سال سے بھی کم عرصے میں (۱۴) سرانجام دیا جا چکا تھا۔

۲) ان مصاحف کی کتابت میں سب سے اہم کردار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا تھا۔ انہوں نے عہدِ نبوی میں بھی کتابت وحی کا کام کیا تھا۔ عہدِ صدیقی میں قرآن کریم کی صحف [چھوٹے چھوٹے اجزاء جن میں سے ہر ایک جزء کم از کم ایک سورت پر مشتمل تھا(۱۵)] میں مکمل کتابت میں بھی ان کا بڑا حصہ تھا۔ اس ۲۰ سال کے عرصے میں عربی املاء کے اصول وقواعد میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا [یہ تغیرات پہلی صدی ہجری کے اواخر میں سامنے آتے ہیں۔] اور اہم کاتب بھی ایک ہی آدمی رہا۔ اس لیے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت زیدؓ بن ثابت یا ان کے ساتھ کام کرنے والے کمیٹی کے دوسرے ارکان نے مصاحفِ عثمانیہ کی کتابت اسی طریق املاء کے مطابق کی جو اُس وقت حجاز خصوصاً مدینہ منورہ میں رائج تھا۔ اور یہ طریق املاء یقیناً عہدِ نبوی میں رائج خط اور املاء سے مختلف نہیں تھا۔

۳) مصاحفِ عثمانیہ نقط اور اعجام سے معرّٰی تھے' اس لیے ہر نسخہ کے ساتھ پڑھانے والا ایک مستند قاری بھی بھیجا گیا تھا۔ عہدِ نبوی سے ہی تعلیم قرآن کی بنیاد محض تحریر پر نہیں بلکہ تلقی اور سماع پر رکھی گئی تھی۔ لوگوں نے اپنی روزانہ تلاوت کے لیے اپنے علاقے کے صدر مقام پر بھیجے گئے مصاحفِ عثمانیہ سے اپنے لیے مصاحف تیار کرنا اور کرانا شروع کر دیے۔ اب ہر نیا مصحف' مصاحفِ عثمانیہ میں سے کسی ایک یا ان سے ہو بہو نقل کردہ کسی ایک نسخہ (مصحف) کی صحیح نقل ہوتا تھا۔ قرآن کریم کی درست قراءت استاد کی شفوی تعلیم پر اور قرآن کی درست کتابت مستند اصل سے ہو بہو نقل پر منحصر تھی۔ مصاحفِ عثمانیہ کی اس ہو بہو نقل کو ہی مصاحفِ عثمانیہ کے رسم (طریق املاء) کا التزام کہا جاتا ہے۔

۴) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کتنے مصاحف تیار کرائے تھے اور وہ کس کس شہر میں بھیجے گئے؟ روایات میں ان کی تعداد چار سے آٹھ تک بیان کی گئی ہے۔ (۱۶) دو نسخے (مصحف) تو مدینہ منورہ میں رہے' ایک عوام الناس کے لیے مسجد نبوی میں رکھا گیا اور ایک حضرت عثمانؓ کی ذاتی نگرانی میں رہا' جسے **المُصحف الامام** بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مکہ مکرمہ' کوفہ' بصرہ اور دمشق میں ایک ایک مصحف (مع قاری) بھیجا جانا ثابت ہے۔ [چار مصاحف والی روایت میں غالباً صرف ان مصاحف کی بات کی گئی ہے جو مدینہ منورہ سے باہر

بھیجے گئے تھے۔] کہتے ہیں کہ ایک ایک نسخہ یمن اور بحرین کے لیے بھی بھیجا گیا تھا' بلکہ بعض نے بحرین کی بجائے مصر میں ایک نسخے کے بھیجے جانے کا ذکر بھی کیا ہے[17]۔تاہم جن مصاحفِ عثمانیہ سے نقل ہو کر مزید مصاحف تیار ہوئے اور جن کے رسم کا گہری نظر سے لفظ بہ لفظ بلکہ حرف بحرف تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کر کے ''علم الرسم'' کی بنیاد رکھی گئی' اس میں صرف پانچ مقامات کے مصاحف عثمانیہ [یا ان سے تیار ہونے والے مصاحف] کا ذکر کتب رسم میں کیا جاتا ہے۔یعنی مکہ' مدینہ' کوفہ' بصرہ اور دمشق کے مصاحف۔[18]

۵) جغرافیائی اعتبار سے اسلامی مملکت کے مختلف حصوں کے لیے ان ارسال کردہ مصاحفِ عثمانیہ کی مرکزی حیثیت کچھ اس طرح مقرر کر دی گئی یا عملاً ہو گئی کہ مکہ اور مدینہ کے مصاحف تمام جزیرہ نمائے عرب کے لیے' بصرہ اور کوفہ کے مصاحف تمام مشرقی علاقوں کے لیے اور دمشق کا مصحف شام کے علاوہ تمام مغربی (افریقی) علاقوں کے لیے نئے مصاحف کی تیاری کے لیے اصل کا کام دینے لگے۔ان مصاحف اور ان کی نقول کو مکی' مدنی' کوفی' بصری اور شامی کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

(٦) آگے چل کر علماء رسم نے مختلف مصاحف کے ذکر کے لیے کچھ اصطلاحات مقرر کر لیں۔مثلاً مدینہ منورہ کے دونوں نسخوں (خاص اور عوام الناس والے) کا ذکر کرنا ہوتا تو ''**مدنیّین**'' کہتے' اور ''**مدنیین**'' اور مکی (یعنی تینوں کا) ذکر کرنا ہوتا تو ''**الحجازیة**'' یا ''**الحرمیة**'' کہتے' اور کوفی اور بصری (دونوں) کے لیے مجموعی طور پر ''**العراقیّین**'' کی اصطلاح استعمال کرتے۔تاہم یہ اصطلاحات اس وقت استعمال کرتے جب اصل مصاحفِ عثمانیہ مراد ہوتے اور اگر ان سے تیار ہونے والی نقول مراد ہوتیں تو صرف مصاحف عراقی' مصاحفِ اہل الشام وغیرہ کہہ کر ذکر کیا جاتا۔[19] کتب الرسم میں ان اصطلاحات کا استعمال عام ہے۔

(٤) ان مراکز خمسہ میں سے ہر ایک مرکزی شہر میں وہاں قیام پذیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں قرّاء کی ایک ایسی جماعت تیار ہوئی جو قراءت کے ساتھ رسم الکلمات (کا طریقہ) بھی بیان کرتے تھے یعنی ادھر بھی توجہ دلاتے تھے۔نقط و اعجام سے معرّٰی مصحف سے قراءتِ روایت کی بنا پر اور استاد سے بالمشافہ ہی سیکھی جا سکتی تھی۔تاہم اس مروی قراءت کے مطابق اپنا (ذاتی) مصحف تیار کرنے کے لیے مصاحفِ عثمانیہ میں سے کسی ایک سے یا اس سے نقل شدہ کسی مصحف سے نقل مطابق اصل کیے بغیر بھی چارہ نہ تھا۔کیونکہ باجماعِ صحابہؓ یہی مصاحف صحت کا معیار قرار پائے تھے۔اس طرح شروع سے ہی قراءت اور رسم ساتھ ساتھ چلے۔

اور یہ ''نقل مطابق اصل'' کا کام اس لیے بھی ضروری تھا یا یوں کہیے کہ ''نقل صحیح'' کے اس عمل سے یہ بات بھی سامنے آنے لگی تھی کہ مصاحفِ عثمانیہ میں ایسے کلمات بھی ہیں' جن کی کتابت میں کوئی یکساں اصول اختیار نہیں کیا گیا تھا۔مثلاً لفظ ''**کتاب**'' کہیں الف کے ساتھ اور کہیں بحذف الف (**کتٰب**) لکھا گیا تھا۔یا مثلاً لفظ ''**نعمة**'' یا ''**رحمة**'' عموماً تو تائے مربوطہ (ۃ) کے ساتھ ہی لکھے گئے مگر بعض مقامات پر تائے مبسوطہ (ت) کے ساتھ لکھے گئے تھے۔اور ایک ہی مصحف کے اندر اس قسم کے تفاوت اور اختلاف کی متعدد صورتیں موجود تھیں۔آگے چل کر

ایسے تمام مقامات کا حصر اور کتابت مصاحف میں اس فرق کو برقرار رکھنا علم الرسم کا ایک اہم مسئلہ بن گیا۔

(۵) جیسا کہ ابھی بیان ہوا' صحابہؓ نے مصاحف کی کتابت اپنے زمانے کے رائج ''طریق املاء'' یا رسم کے مطابق ہی کی تھی۔ اس زمانے میں یہی طریق املاء عام کتابت کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا اور یہ طریقہ تابعین (بلکہ تبع تابعین) کے دَور تک جاری رہا[۲۰] کہ قرآنی املاء اور عام عربی املاء میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ ایک لفظ جس طرح قرآن میں لکھا جاتا تھا' شعر وادب میں یا کسی سرکاری یا ذاتی مراسلات وغیرہ میں بھی اسی املاء کے ساتھ لکھا جاتا تھا' اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کی قرآنی املاء (یا رسم) کے بعض طریقے عام عربی املاء میں اس طرح رچ بس گئے کہ اس کی بعض یادگاریں عام عربی املاء میں اب تک محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر ابھی آگے چل کر آئے گا۔

(٦) جب کوفہ اور بصرہ کی چھاؤنیاں علمی مراکز کے طور پر اُبھریں اور یہاں عربی زبان ولغت اور شعر وادب کے ساتھ ساتھ صَرف اور نحو کے علوم کی ایجاد اور تدوین ہوئی' اور علمی' سرکاری اور روزمرہ کی سطح پر عربی زبان میں کتابت کی بھی بکثرت ضرورت پڑنے لگی' تو علماء وقت نے عربی املاء کو صرفی اور نحوی اصولوں کی روشنی میں یکساں اور کلی قواعد کے ماتحت کرنا ضروری سمجھا۔ اور اس کے لیے بنیادی طور پر املاء کلمات میں صوتی اصول (The Phonetic Principle) یعنی لفظ کو اس کے نطق یا تلفظ کے مطابق لکھنے کا اصول اختیار کرنے کو ترجیح دی گئی۔ مثلاً یہ کہ:

ا) ''الف لینہ متوسطہ'' کو ہمیشہ بصورت الف ہی لکھنا چاہیے[۲۱] اس لیے جو واؤ صرفی تعلیل کی بنا پر الف میں بدل جائے (بلحاظ تلفظ) اسے لفظ میں بصورت الف ہی لکھنا چاہیے۔ اس قاعدے کے تحت ''صلٰوۃ'' کو صلاۃ اور ''نجوٰۃ'' کو نجاۃ لکھنا بہتر سمجھا گیا۔

ب) اسی طرح واؤ جمع کے بعد زائد الف لکھنا تو تسلیم کر لیا گیا (مثلاً ضربوا اور قالوا میں) مگر کسی ناقص واوی کے صیغہ مضارع واحد غائب (مثلاً یدعو' یمحو) میں واؤ کے بعد الف لکھنا غلط قرار دیا گیا۔[۲۲]

ج) اسی (الف لینہ متوسطہ والے) قاعدے کے تحت جمع مؤنث سالم کی آخری ت سے پہلے الف لکھنا بھی ضروری سمجھا گیا (مسلمات' حسنات میں)۔

د) اسی طرح صیغہ جمع مؤنث غائب کے ساتھ التباس سے بچنے کے لیے ماضی جمع متکلم میں بھی آخر پر الف کا لکھنا ضروری قرار پایا۔ اس قاعدے کی بنا پر ہی انزلنہ کو انزلناہ کی شکل میں لکھنے لگے' وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم میں پہلی شکل استعمال کی گئی تھی۔

اس طرح صرفی اور نحوی قواعد کی روشنی میں ھجاء اور املاء کے قیاسی قواعد کے ارتقاء کا ایک دَور شروع ہوا اور اس کے اصول وقواعد میں تغیر وتبدل اور اصلاح وترمیم کا عمل جاری رہا۔[۲۳] [اور کسی حد تک یہ اب بھی جاری ہے] اور اس فن یعنی املاء قیاسی کے اصول وقواعد پر مشتمل مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں۔[۲۴]

املاء قیاسی کی اصلاح اور اس کے انضباط کی اس صرفی ونحوی مہم کے نتیجے میں لوگوں نے بہت سے کلمات کا

قدیم ھجاء اور املاء ترک کر دیا اور ان کو نئے اصولوں کے مطابق لکھنے لگے [۲۵] تاہم رسم قرآنی کو ان قواعد کے تحت لانے کو قبول نہیں کیا گیا اور قرآن کریم کی کتابت بدستور ''نقل مطابق اصل'' کے اصول پر برقرار رکھی گئی۔ اس طرح قرآن کریم میں لوگوں کو ان قواعدِ نحو کی ''خلاف ورزی'' کی بکثرت مثالیں نظر آنے لگیں' حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ قرآنی رسم تو کبھی ان قواعد کے تابع تھا ہی نہیں۔

(۷) اِملاء اور ھجاء کے قدیم اصولوں میں ان تبدیلیوں اور اصلاحات کے باوجود کُتّابِ مصاحف کے ہاں عثمانی مصاحف کے طریق املاء یا رسم الخط کا اتباع جاری رہنے کی کچھ وجوہ تھیں' مثلاً:

ا) اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس ''رسم'' میں اب ایک طرح سے تبرک اور تقدیس کا پہلو پیدا ہو گیا تھا۔ [اور رسم قرآنی کا یہ پہلو کبھی بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا گیا۔]

ب) دوسرے' ایک طویل عرصے کے استعمال سے کُتّابِ مصاحف اس طریقِ املاء سے مانوس بھی ہو گئے تھے۔ [۲۶]

ج) تیسرے یہ بھی کہ مصحف کی کتابت کسی مصحف سے ہی براہ راست اور ہو بہو نقل پر منحصر تھی۔ اس سے بھی ''رسم'' سے منحرف ہونے کی گنجائش کم ہی نکلتی تھی۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ بعض کلمات کا قدیم یا قرآنی طریق املاء (یا رسم الخط) کثرتِ استعمال کی بنا پر ذہنوں میں اس طرح رچ بس گیا تھا کہ اسے املاء قیاسی کے علمبرداروں نے بھی اپنی اصلی صورت پر برقرار رکھنا قبول کر لیا' بلکہ ان کلمات کو قرآنی املاء کے ساتھ لکھنا ہی درست قرار دیا۔ آج بھی عام عربی املاء (**الرسم المعتاد**) میں بکثرت ایسے کلمات ملتے ہیں جن کی املاء ''صوتی اصول'' (The Phonetic Principle) یعنی نطق کے مطابق کتابت کے اصول کی بجائے ایک طرح سے ''تاریخی اصول'' (The Historic Principle) کے تحت کی جاتی ہے۔ مثلاً: **بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم، لا الٰہ الا اللّٰہ، الّذین، ھٰھُنا، لٰکِنْ، ھٰذا، ذٰلك، اُولٰئِك، ھٰؤُلاءِ، اُولُوْ، ھٰانتم، اُولاءِ، اُولاتُ، بلٰی، حتّٰی، متٰی، اِلٰی** وغیرہ۔ جن کو اگر رسم املائی کے صوتی یا نحوی اصل پر مبنی قواعد کے مطابق لکھا جائے تو ان کی شکل یوں ہو جائے گی: **باسم اللاّٰہ الرحمان الرحیم' لا اِلاہ الا اللاّٰہ، اَللّذین، ھاھنا، لاکن، ھاذا، ذالك، اُلائِك، ھا اُلاءِ، اُولُوْ، ھاانتم، اُلاءِ، اُلاتُ، بلا، حتّا، متااور اِلا۔** [۲۷]

(۸) دریں اثنا نقط و شکل اور علاماتِ ضبط کی ایجاد و اختراع نے قرآنی (اور عام عربی) کلمات کا تلفظ نسبتاً آسان کر دیا تھا۔ تاہم قیاسی یا عام املاء کے مطابق لکھی ہوئی عبارت پڑھ لکھ سکنے والے آدمی کے لیے قرآنی املاء یا رسم المصحف کا رسم قیاسی سے یہ اختلاف ایک الجھن کا باعث بنتا تھا۔ اور غالباً اسی لیے امام مالک بن انسؒ (ت ۱۷۹ھ) سے یہ مشہور سوال پوچھا گیا تھا کہ کیا قرآنی املاء کو بھی جدید املاء کے سانچے میں ڈھال لیا جائے؟ جس کا جواب انہوں نے نفی میں دیا تھا اور سلف کے طریقے کے مطابق رسم المصحف کو علیٰ حالہ برقرار رکھنے پر زور دیا تھا۔ البتہ انہوں نے بچوں کی تعلیم میں سہولت کے لیے (قاعدے یا تختی کی صورت میں) رسم عثمانی سے ہٹ کر قیاسی املاء کے مطابق (اسباق) لکھنے کو جائز قرار دیا تھا۔ [۲۸]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ رسم قرآنی بیشتر رسم قیاسی کے مطابق ہی ہے۔صرف ایک قلیل تعداد کلمات کی ایسی ہے جن میں اختلاف ہے۔قرآن کریم کے ستر ہزار سے زائد کلمات میں سے قریباً نوے فیصد (۹۰%) کلمات کی املاء عام قیاسی املاء کے مطابق ہی ہے [۲۹]۔دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ عربی رسم الخط دورِ صحابہ تک اتنی پختگی کو پہنچ چکا تھا کہ اس میں ترمیم واصلاح کی بڑی محدودسی ضرورت در پیش آئی۔

(۹) فریضۂ حج کے ذریعے وسیع اسلامی مملکت کے مغربی (افریقہ واندلس) اور مشرقی (ایشیا) علاقوں سے لوگوں کو حرمین شریفین میں آنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔[۳۰] اس کے علاوہ طلب علم کے لیے بھی لوگ ایک علاقے سے دوسرے علاقوں خصوصاً بڑے شہروں کا رخ کرتے تھے۔ان علمی اور دینی رحلات (سفروں) میں اہل علم کو اپنے اپنے مختص علم وفن کی تحصیل اور تکمیل کے مواقع میسر آتے تھے۔قراءات اور علم الرسم کے شائقین کو اس ضمن میں مصاحف امصار (یعنی مختلف صوبائی صدر مقامات میں بھیجے گئے مصاحف عثمانیہ یا ان سے تیار کردہ اس علاقے کے مصاحف) دیکھنے‘ بلکہ ان کا تقابلی اور تنقیدی مشاہدہ کرنے کے مواقع ملے تو دقت نظر سے کام لینے والوں کو یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بعض قرآنی کلمات کی املاء یا رسم کسی ایک علاقے کے (مثلاً عراقی) مصاحف میں ایک طریقے سے اور کسی دوسرے علاقے کے (مثلاً شامی یا مکی) مصاحف میں کسی دوسرے طریقے سے کی گئی تھی۔

اس طرح علماءِ رسم کو کتابتِ مصاحف کے ضمن میں تین قسم کے املائی اختلافات سے واسطہ پڑنے لگا:

۱) رسم المصحف کا عام رسم قیاسی سے اختلاف۔

۲) ایک ہی مصحف کے اندر بعض کلمات کا مختلف مقامات پر مختلف رسم میں لکھا ہوا ملنا۔

۳) مصاحف امصار (علاقائی مصاحف) کا بعض کلمات کے رسم میں باہمی اختلاف۔

ذیل میں بطور نمونہ ہر قسم کے اختلافات کی کچھ مثالیں دی جاتی ہیں:

۱) رسم قیاسی اور رسم قرآنی کا اختلاف:

رسم قرآنی	رسم قیاسی
اَلْئٰنَ	الآنَ
اِیّٰیَ	اِیّایَ
العُلَمٰٓؤُا	العُلَمَاءُ
جِایْءَ	جِیْءَ
لِشَایْءٍ	لِشَیْءٍ
لَاَ اذْبَحَنَّه	لَاَذْبَحَنَّه
دُعٰؤُا	دُعاء
ساُورِیْکم	ساُریکم

لَتَّخَذْتَ	لَاتَّخَذْتَ
الَّيْل	اللَّيْل
الاِنسٰن	الاِنسان
سَلٰسِلاَ	سَلٰسِلَ
يَبنُومَّ	يَابْنَ اُمَّ
بِاَيْيدٍ	بِاَيْدٍ
اَفَائِنْ	اَفإِنْ
اَلّٰتِىْ	اَللَّاتِىْ
نُـنْجِىْ	نُنْجِىْ

وغیرہ

۲) ایک ہی مصحف میں کلمات کی مختلف املاء:

ایک جگہ	دوسری جگہ
كِتٰب	كِتاب
قٰل	قال
طَغَا	طَغٰى
لدا	لدى
اَيُّها	اَيَّهَ
مانَشاءُ	ما نَشٰؤُا
اِبْرَاهِم	اِبْرَاهِيمْ
كَيْ لَا	كَيْلا
جَزاؤُا	جَزاءُ
اَئِذا	اَءِ ذا
يَمْحُوا	يَمْحُ
شَعَائِر	شَعٰئِر
تَبٰرَكَ	تَبارَكَ

وغیرہ

۳) مصاحف امصار کے اختلاف:

بعض مصاحف میں	اور بعض مصاحف میں
تُكَذِّبان	تُكَذِّبْن

طائف	طٰئف
خائف	خٰئفِ
صٰفّٰت	صافّات
کِیۡدُونِ	کِیۡدُونِی
شرکاؤھم	شرکائھم
ذوالعصۡف	ذاالعَصۡف
تجری تحتَھا	تجری من تحتِھا
منھا مُنقَلَبا	منھما مُنۡقَلَبا وغیرہ

۴) مصحف میں مماثل کلمات کی مختلف املاء:

مائة میں الف ہے مگر فئة بحذف الف ہے' اللطیف میں دو لام موجود مگر الیّل ہر جگہ صرف ایک لام کے ساتھ' ایّاک میں تو الف ہے مگر اِیّٰیَ میں محذوف ہے۔ لدا الباب الف کے ساتھ' مگر لدی الحناجر یاء کے ساتھ' جایءَ میں الف موجود مگر سِیۡءَ الف کے بغیر' اَبۡوٰب بحذف الف مگر اَکۡوَاب باثبات الف لَاۡاَذۡبَحَنَّہ میں زائد الف موجود مگر لَاُعَذِّبَنَّہ اس زیادۃ کے بغیر ہے۔ مِن وَرَایِٔ حِجَاب بزیادۃ یاء مگر مِن وراءِ جُدُر بغیر زیادۃ' واؤ جمع کے بعد ہر جگہ الف زائد موجود مگر صرف چار افعال جاءُ و 'فَاءُ و 'باءُ و اور تبوءُ و میں غیر موجود وغیرہ۔(۳۱)

۵) اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ بعض کلمات کی قرآنی املاء' قیاسی املاء سے زیادہ سائنٹفک اور قیاسِ صرفی ونحوی سے زیادہ قریب' لہٰذا بہتر ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

قیاسی املاء		قرآنی املاء		
اشتراہ	کی بجائے	اشترٰہ	زیادہ بہتر ہے	
مَثۡواہ	"	مَثۡوٰہ	"	"
اِحداھما	"	اِحدٰھما	"	"
یَغشاھا	"	یَغشٰھا	"	"
ترضاہ	"	ترضٰہ	"	"
نَجّاکم	"	نَجّٰکم	"	"
تَقۡواھا	"	تَقۡوٰھا	"	" وغیرہ

(۱۰) ہر کاتبِ مصحف کا یہ فرض تھا کہ وہ کتابتِ مصحف میں ان اختلافات سے آگاہ ہو اور جس علاقے کے لیے وہ مصحف لکھ رہا ہو یا جس علاقے کے مصحف سے وہ لکھ رہا ہو' کتابت میں یعنی رسم کلمات میں اس علاقے کی

خصوصیاتِ رسم کوملحوظ رکھے۔ نقل صحیح میں ان چیزوں کے نظر انداز ہونے کا امکان تو نہیں رہتا' تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر خطاط یا خوشنویس کم علم ہوتے ہیں اور پیشہ ور خطاط جلدی کی خاطر اس قسم کی شرائط کو اکثر ملحوظ نہیں رکھتے۔ اس لیے رسم المصحف پر ماہرانہ نظر رکھنے والے اہل علم نے ایسی کتابیں لکھنا شروع کیں جو ''کُتّابِ مصاحف'' کی راہنمائی کرسکیں اور ان کو فرداً فرداً ان تمام مقامات سے آگاہ کرسکیں جہاں املاء میں رسم قرآنی کے مطابق درست املاء سے بھٹک جانے کا خطرہ موجود ہو۔

دوسرے اسلامی علوم کی طرح اس علم میں بھی تالیف کی ابتداء ایسے مختصر ''رسائل'' سے ہوئی جن میں عموماً کسی ایک پہلو سے جزوی معلومات ہوتی تھیں۔ آہستہ آہستہ متفرق رسائل کی معلومات کو یکجا کر کے علم الرسم پر بڑے مجموعے تیار ہوئے' یہاں تک کہ تدوین عروج کو پہنچی اور اس فن کی ''اُمّھات الکُتُب'' تالیف ہوئیں۔ اس کے بعد انتخاب' تلخیص اور شروح کا سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ علم الرسم کی کتابوں میں سے بعض میں مصاحف عثمانیہ کی (تیاری کی) تاریخ کو بھی ساتھ شامل کرلیا گیا' اور بعض کتابوں میں مرسوم المصاحف کے اختلافات کی تعلیل اور توجیہہ کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا' اور بعض میں رسم عثمانی کے التزام یا عدمِ التزام کی بحث کو بھی لے لیا گیا۔ ان چیزوں کی ابھی آگے وضاحت آئے گی۔

مختلف اسلامی علوم کی تدوین اور ان پر تالیفات کے سلسلے میں یہ ایک عجیب بات سامنے آتی ہے کہ بعض علوم پر کسی ایک علاقے میں زیادہ کام ہوا اور بعض علوم پر دوسرے خطے میں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث کی جمع وتدوین اور اس علم کی امہات الکتب کی تالیف کا بیشتر کام مشرقی اسلامی ملکوں میں سرانجام پایا۔ اس کے برعکس علم الرسم کی جمع وتدوین اور اس فن کی امہات الکتب کی تصنیف وتالیف کا کام عالم اسلام کے مغربی حصے خصوصاً اندلس میں زیادہ ہوا۔ (۳۲)

اہل مشرق کی تالیف کردہ کتب حدیث (بخاری ومسلم وغیرہ) کو مغرب میں پذیرائی حاصل ہوئی اور اہلِ مغرب کی تالیف کردہ کتب علم الرسم کو اہل مشرق نے اپنے لیے راہنما بنایا' بلکہ یہ کتابیں بلا اختلاف مسلمانوں کے تمام مذاہب ومسالک کے ہاں مستند مانی جاتی ہیں۔ 'نامہ آستان قدس' شمارہ ۱و۲' دورہ نہم میں عزیز اللہ جوینی کا ایک مضمون بعنوان ''املاء قرآن'' شائع ہوا تھا جس میں مضمون نگار نے ''املاء قرآن'' پر اہم اور بنیادی کتابوں میں الدانی' المراکشی اور ارکاٹی کی کتابوں کو ہی گنوایا ہے۔ ان کا قدرے تفصیلی ذکر ابھی آگے آرہا ہے۔ البتہ اس نے دو ایرانی مؤلفین کی کتابوں کا نام بھی لیا ہے۔ ان کا ذکر ہم پہلے ہی کیے دیتے ہیں: (۱) احمد بن حسین اصفہانی نیشاپوری (ت ۳۸۱ ھ) کی ''اختلافِ ہجاء قرآنی'' (جو غالباً فارسی میں ہے) اور (۲) حافظ اصفہانی کی ''کتاب المصاحف''۔ (۳۳)

علم الرسم پر اس قدر زیادہ کام ہوا ہے کہ اس فن کی تمام کتابوں کا شمار بھی کارِ دشوار ہے۔ اس کثرتِ تالیفات کا ایک سبب غالب یہ بھی بنا کہ مصاحف کی تیاری مسلمانوں کی روزمرہ کی ضروریات کا ایک جزء تھا (اور ہے)۔ ہر مسلمان کو نہیں تو کم از کم ہر مسلمان کنبہ کو ایک مصحف کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس بنا پر ہر ایک کاتب مصحف کے پاس ایک مختصر راہنمائے رسم قرآنی کی قسم کی کتاب یا رسالہ کا ہونا ضروری تھا' جس میں کم از کم

ضروری مقامات کی املاء کے بارے میں معلومات اور ہدایات موجود ہوں۔ چنانچہ قرآن کریم کے ایسے تمام مقامات کی سورت بسورت نشان دہی پر مبنی متعدد مختصر کتب بھی لکھی گئیں۔

ذیل میں ہم ترتیب زمانی کے ساتھ اس علم پر لکھی گئی بعض اہم ''ابتدائی'' اور ''انتہائی'' تالیفات اور ان کے مؤلفین کا مختصراً ذکر کرتے ہیں، جس سے اس علم کے عہد بعہد ارتقاء کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

علم الرسم پر تالیفات

(۱۱) سب سے پہلے ہمیں ابن الندیم کے ہاں اس علم پر یا اس کے بعض پہلوؤں پر لکھی ہوئی کچھ کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک عنوان ''**الکتب المؤلفه فی مقطوع القرآن وموصوله**'' ہے جس کے تحت اس نے تین مؤلفین کے نام لیے ہیں: (۱) عبداللہ بن عامر الیحصبی (ت ۱۱۸ھ)۔ (۲) حمزہ بن حبیب الزیات (ت ۱۵۶ھ) اور (۳) علی بن حمزہ الکسائی (ت ۱۸۹ھ)۔ اسی کتاب (**الفهرست**) میں **الکتب المؤلفه فی اختلاف المصاحف** کے عنوان کے تحت آٹھ مؤلفین اور ان کی کتابوں کے نام ملتے ہیں: (۱) عبداللہ بن عامر الیحصبی (ت ۱۱۸ھ) کی کتاب ''**اختلاف مصاحف الشام والحجاز والعراق**'' (۲) علی بن حمزہ الکسائی (ت ۱۸۹ھ) کی ''**کتاب اختلاف مصاحف اهل المدینة واهل الکوفة واهل البصرة**'' (۳) خلف بن ھشام البزاز (ت ۲۲۹ھ) کی کتاب ''**اختلاف المصاحف**'' (۴) یحییٰ بن زیاد الفراء (ت ۲۰۷ھ) کی کتاب ''**اختلاف اهل الکوفة والبصرة والشام فی المصاحف**''۔ ان کے علاوہ ابن الندیم نے ابوحاتم سجستانی (ت ۲۵۵)، ابوداؤد سجستانی، المدائنی اور محمد بن عبدالرحمٰن الاصفہانی میں سے ہر ایک کی کتاب ''**اختلاف المصاحف**'' کا ذکر بھی کیا ہے۔

ابتدائی دور میں رسم کے موضوع پر لکھی گئی متعدد کتابوں کے لیے ھجاء المصاحف یا کتاب الھجاء کا نام بھی ملتا ہے۔ ''**الکتب المؤلفه فی هجاء المصاحف**'' کے تحت ابن الندیم نے تین مؤلفین کا ذکر کیا ہے: (۱) یحییٰ بن الحارث الذماری (ت ۱۴۵ھ) (۲) احمد بن ابراہیم الوراق (ت ۲۷۰ھ) اور (۳) ابن شبیب [۳۴]۔ صاحب المقنع نے الغازی بن قیس الاندلسی (ت ۱۹۹ھ) کی ''**فی هجاء المصاحف**'' اور محمد بن عیسیٰ الاصفہانی (ت ۲۵۳ھ) کی ''**هجاء المصاحف**'' کا ذکر کیا ہے [۳۵]۔ غانم قدوری نے ھجاء المصاحف کے عنوان سے لکھی گئی چار مزید کتابوں کا اضافہ کیا ہے: (۱) ابن مقسم العطار (ت ۳۶۲ھ) کی ''**اللطائف فی جمع هجاء المصاحف**'' (۲) ابوالعباس المھدوی (ت ۴۳۰ھ) کی ''**هجاء مصاحف الامصار**'' (اس کتاب کا ایک جزء مجلّہ معہد المخطوطات، جلد ۱۹ میں شائع ہو چکا ہے) (۳) مکی بن طالب القیسی (ت ۴۳۷ھ) کی ''**البدیع فی هجاء المصاحف**''[۳۶] (یہ کتاب بھی غانم قدوری کی تحقیق کے ساتھ عراق کے مجلّہ المورد، العدد الرابع، ۱۴۰۷ھ میں شائع ہو چکی ہے)[۳۷]۔ ''**کتاب الهجاء**'' کے عنوان کے تحت ابن الندیم نے الکسائی، الفراء، ابوحاتم سجستانی اور ابن بشار الانباری (ت ۳۲۷ھ) کی کتابوں کا ذکر کیا ہے [۳۸] مگر یہ بات واضح

نہیں ہوسکی کہ ان کا تعلق ''ھجاء قرآنی'' سے تھا یا ھجاء قیاسی (نحوی) سے تھا۔ یہاں تک علم الرسم پر تالیفات کا ابتدائی یا تشکیلی دَور ختم ہوتا ہے۔

(۱۲) اس کے بعد مذکوہ بالا آخری تین مؤلفین المہدوی، القیسی اور الجھنی کی معاصر مگر اس فن کی ''دیوقامت'' شخصیت سامنے آتی ہے یعنی ابوعمرو عثمان بن سعید الدانی الاندلسی (ت ۴۴۴ھ) جو اپنے زمانے میں ابن الصیرفی کے نام سے مشہور تھے اور جن کی کل تصانیف کی تعداد سو سے زیادہ بیان کی گئی ہے، جن میں سے گیارہ کتابیں علم الرسم سے متعلق تھیں اور ان میں سب سے اہم، سب سے مشہور اور سب سے مفید تر کتاب ''**المقنع الکبیر**'' تھی، جس کی تلخیص خود مؤلف نے ''**المقنع الصغیر**'' کی صورت میں کی (۳۹) اور جو ''**المقنع فی معرفة مرسوم مصاحف اهل الامصار**'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ الدانی کی یہ کتاب علم الرسم پر لکھی گئی تمام پیشرو کتابوں کی جامع اور اپنے بعد آنے والی کتابوں کی بنیاد ٹھہری۔ اس کتاب میں الدانی نے لفظ رسم اور مرسوم بکثرت استعمال کیا ہے (۴۰)۔ چنانچہ بعد کی کتابوں کے عنوانات پر عموماً یہی لفظ غالب نظر آتا ہے اور کم از کم عنوانِ کتب میں لفظ ''ھجاء'' کا استعمال آہستہ آہستہ متروک ہو جاتا ہے۔

الدانی کے بعد اس علم پر لکھی جانے والی کتابوں میں سے خصوصاً قابل ذکر حسب ذیل ہیں۔ اہم کتابوں کے ساتھ ہم نے کچھ مزید تعارفی نوٹ بھی بڑھا دیا ہے:

۱) ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی (ت ۴۶۳ھ) کی ''**تلخیص المتشابه فی الرسم**'' (۴۱)۔

۲) ابوداؤد سلیمان بن نجاح الاندلسی (ت ۴۹۶ھ) کی ''**التنزیل فی هجاء المصاحف**'' جو اس کی چھ جلدوں پر مشتمل ایک بڑی کتاب ''**التبیین لهجاء التنزیل**'' کی خود تیار کردہ تلخیص تھی۔ یہ غالباً آخری بڑی کتاب ہے جس کے عنوان میں لفظ ''ھجاء'' استعمال ہوا۔ اگرچہ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی تاہم اس کے کچھ مخطوطات (القاہرہ اور دمشق وغیرہ میں) موجود ہیں۔ یہ ابوداؤد الدانی کے نامور تلامذہ میں سے تھے۔ ہمارے زمانے میں شائع ہونے والے چند اہم مصاحف (قرآنی ایڈیشنوں) کی تیاری میں الدانی اور ابوداؤد کی کتابوں کو ہی رسم المصحف کی بنیاد بنایا گیا ہے، اور ان دونوں میں اختلاف کی صورت میں مصری، سعودی اور شامی مصاحف میں ابوداؤد کو اور لیبی ''**مصحف الجماهیریه**'' کی تیاری میں الدانی کے قول کو ترجیح دی گئی ہے۔ (۴۲)

۳) ابوالحسن علی بن محمد المرادی (ت ۵۶۳ھ) کی ''**المنصف**''۔

۴) ابن العطار الھمدانی (ت ۵۶۹ھ) کی ''**اللطائف فی رسم المصاحف**''۔

۵) القاسم بن فیرہ الشاطبی (ت ۵۹۰ھ) کا قصیدہ ''**رائیه فی الرسم الموسوم بعقیلة اتراب القصائد فی اسنی المقاصد**''۔ یہ معمولی اضافوں (کل چھ کلمات) کے ساتھ **المقنع للدانی** کا خلاصہ ہے۔ اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی متعدد شروح لکھی گئیں، جن میں سے بعض کا ذکر ابھی آئے گا۔

۶) ابوطاہر العقیلی اسماعیل بن ظاہر (ت۶۲۳ھ) کی ''مختصر ما رسم فی المصحف الکریم۔''(۴۳)

۷) ابن وثیق الاندلسی (ت۶۵۴ھ) کا ''رسالة فی رسم المصحف۔''

۸) محمد بن ابراہیم الشریشی الخراز (ت۷۱۸ھ) کی ''مورد الظمآن فی رسم احرف القرآن''۔ یہ منظوم کتاب ہے اور الخراز کی ہی ایک سابق تالیف ''عمدة البیان'' کا خلاصہ ہے۔اس کتاب کے دو حصے (یکجا) ہیں۔ پہلا علم الرسم سے متعلق ہے اور دوسرے حصے کا موضوع علم الضبط ہے اور اسے مورد الظمآن کی ذیل یا ضبط الخراز بھی کہتے ہیں۔مورد الظمآن چونکہ اپنے سے پہلی چار اہم کتابوں المقنع' التنزیل' المنصف اور العقیلة سے ماخوذ ہے' اس لیے اس کو بھی اہل علم میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی بھی کئی شروح لکھی گئیں' جن میں سے بعض کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔

۹) ابو العباس المراکشی الشہیر بابن البناء (ت۷۲۱ھ) کی ''عنوان الدلیل فی مرسوم خط التنزیل''۔اس کتاب میں رسم المصحف کے عام خط سے مختلف ہونے کی عجیب وغریب ''باطنی'' قسم کی تعلیلات اور توجیہات بیان کی گئی ہیں۔اصل کتاب تو ابھی تک نہیں چھپی' البتہ زرکشی نے البرہان میں اس کے طویل اقتباسات دیے ہیں۔(۴۴)

۱۰) برہان الدین ابراہیم بن عمر الجعبری (ت۷۳۲ھ) کی ''روضة الطرائف فی رسم المصاحف'' یہ لامیہ قصیدہ ہے جو شاطبی کے رائیہ کی طرز پر لکھا گیا۔

۱۱) ابو یحییٰ محمد بن محمود الشیرازی السمرقندی (ت۷۸۰ھ) کی کتاب ''کشف الاسرار فی رسم مصاحف الامصار''۔اس کتاب کے دو باب حاتم صالح الضامن کی تحقیق کے ساتھ مجلة المورد' العدد الرابع' ۱۴۰۷ھ میں شائع ہو چکے ہیں۔(۴۵)

اس کے بعد ہمیں گیارہوں بارہویں صدی میں بعض ایسی تالیفات کا پتہ چلتا ہے جن کے نام (عنوان) میں خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا ان کے مصاحف کا نام آتا ہے۔یہ سب مخطوطات ہیں اور بیشتر مجہول المؤلف بھی ہیں۔مثلاً:

۱) حسین بن علی الاماسی (گیارہویں صدی ہجری) کی ''الطارف الطریفة فی رسم المصاحف العثمانیة الشریفة''۔

۲) مؤلف مجہول۔ جامع الکلام فی رسم المصحف الامام۔

۳) مؤلف مجہول۔رسالة فی بیان قواعد رسم المصحف العثمانی۔

۴) مؤلف مجہول۔ زبدة البیان فی رسوم مصاحف عثمان۔ (۴۶)

(۱۳) علم الرسم پر تالیفات کا یہ سلسلہ چودہویں صدی ہجری کے آخر تک بھی جاری رہا ہے۔اس متأخر دور کی کتابوں میں سے قابلِ ذکر حسبِ ذیل ہیں۔یہ سب (کم از کم ایک دفعہ) طبع ہو چکی ہیں۔(۴۷)

۱) الشیخ برکات بن عریشہ الہوریني کی کتاب ''الجوهر الفرید فی رسم القرآن المجید''۔
۲) الشیخ محمد ابوزید کی ''فتح الرحمن وراحة الکسلان''۔
۳) الشیخ عبدالرحمٰن محمد الہواش کی ''تشحیذ الاذهان فی رسم آیات القرآن''۔
۴) ابوعبید رضوان بن محمد المخللاتی (۱۳۱۱ھ) نے ''ارشاد القراء والکاتبین الیٰ معرفة رسم الکتاب المبین'' کے نام سے کتاب بھی لکھی اور رسم عثمانی کے مطابق ایک مصحف بھی شائع کرایا۔
۵) المتولی محمد بن احمد بن الحسن نے ایک ارجوزہ ''اللؤلؤ المنظوم'' کے نام سے لکھا جس کی شرح الشیخ حسن بن خلف الحسینی نے ''الرحیق المختوم'' کے نام سے لکھی۔
۶) الشیخ محمد بن علی بن خلف الحسینی (۱۳۵۷ھ) نے ''ارشاد الحریان الی معرفة ما یجب اتباعه فی رسم القرآن'' نام کا ایک رسالہ تالیف کیا جو دراصل (اس زمانے کے) ہندوستان سے بھیجے گئے ایک استفسار کا جواب تھا۔
۷) الشیخ محمد بن حبیب اللہ الشنقیطی (۱۳۶۳ھ) نے ''ایقاظ الاعلام لوجوب اتباع رسم المصحف الامام'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ مرحوم رسم قرآنی کے بارے میں سختی سے نظریہ توقیف کے حامی تھے۔ اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔
۸) محمد غوث بن ناصر الدین ارکاٹی کی کتاب ''نثر المرجان فی رسم نظم القرآن'' علم الرسم کے موضوع پر سب سے مبسوط کتاب ہے جو سات جلدوں میں حیدرآباد دکن سے ۴۹-۱۳۳۹ھ میں قریباً دس برس میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب خدمت قرآن کے لیے استقامت سے کام کرنے اور ''محنت عشق'' (Love Labour) کی ایک زندہ اور روشن مثال ہے۔
۹) الشیخ علی محمد الضباع استاد جامع الازہر نے ''سمیر الطالبین فی رسم وضبط الکتاب المبین'' کے نام سے ایک کتابچہ تالیف کیا۔ یہ چھوٹی سی کتاب بقول مؤلف المقنع' التنزیل اور العقیلة کے مسائل کا جامع خلاصہ ہے۔ اس میں بات سمجھانے کا مختصر مگر قابل فہم انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ان کی تمام آراء سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا' تاہم مجموعی طور پر کتاب پر ''بقامت کہتر بقیمت بہتر'' کی مثل صادق آتی ہے۔

(۱٤) علم الرسم کی ''امہات الکتب'' میں سے الشاطبی کے قصیدہ ''العقیلة'' اور الخراز کی مورد الظمآن کو اساتذۂ فن کے ہاں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی متعدد شروح لکھی گئیں۔ علم الرسم پر اہم تالیفات کی کوئی فہرست ان شروح کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہلاسکتی۔ لہٰذا ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

☆ شاطبی کے ''عقیلة اتراب القصائد'' کی اہم شروح یہ ہیں:
۱) علم الدین علی بن محمد السخاوی (ت ۶۴۳ھ) کی شرح ''الوسیلة الی کشف العقیلة''۔
۲) برہان الدین عمر بن ابراہیم الجعبری (ت ۷۳۲ھ) نے ''خمیلة ارباب المراصد فی شرح عقیلة اتراب القصائد'' کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ (۴۸)

۳) ابوالبقاء علی بن عثمان ابن القاصح (ت ۸۰۱ھ) نے ''تلخیص الفوائد وتقریب المتباعد'' کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے اور غالباً العقیلہ کی شروح میں سے واحد مطبوعہ شرح ہے۔

۴) مُلّا علی بن سلطان القاری الہروی (ت ۱۰۱۴ھ) کی شرح کا نام ''الهبات السنية العلية على ابيات الرائية فى الرسم'' ہے۔

۵) مشہور روسی عالم موسیٰ جار اللہ رستوفدانی (ت ۱۳۶۸ھ) نے بھی العقیلہ کی شرح لکھنا شروع کی تھی جو غالباً مکمل نہ ہوسکی۔ (۴۹)

☆ الخراز کی ''مورد الظمآن'' کی شروح میں سے اہم یہ ہیں:

۱) الشیخ حسین بن علی الرجراجی (ت ۸۴۰ھ) کی شرح کا نام ہے ''تنبيه العطشان على مورد الظمآن''۔

۲) ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن عبدالجلیل التنسی (ت ۸۹۹ھ) نے ''الطراز على ضبط الخراز'' کے نام سے مورد الظمآن کی صرف ذیل (ضبط والے حصے) کی شرح لکھی۔ یہ ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔

۳) ابومحمد عبدالواحد بن احمد بن علی ابن عاشر الانصاری (ت ۱۰۴۰ھ) کی ''فتح المنان المروى بمورد الظمآن'' سب سے مشہور شرح ہے۔ اس شارح نے حصہ رسم کے آخر پر ''الاعلان بتكميل مورد الظمآن'' کے نام سے ایک تکملہ بھی لکھا' جس کا مقصد دوسری قراءات کو بھی شامل کرنا تھا' کیونکہ اصل ''مورد'' صرف قراءات نافع پر مبنی تھی۔

۴) الشیخ ابراہیم بن احمد المارغنی التونسی (۱۳۲۵ تاریخ تکمیل کتاب) کی ''دليل الحيران شرح مورد الظمآن'' کے کئی ایڈیشن تونس اور مصر سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کے رسم والے حصے میں ابن عاشر کی ''فتح المنان'' سے اور ضبط والے حصے کے لیے التنسی کی ''الطراز'' سے زیادہ مدد لی گئی ہے۔

۵) الشیخ احمد محمد ابوزیتحار نے ''لطائف البيان فى رسم القرآن شرح مورد الظمآن'' کے نام سے طلبہ کے استفادہ کے لیے ایک مختصر شرح لکھی ہے۔ مؤلف خود جامع الازہر کے اساتذہ میں سے ہیں۔

(۱۵) ماضی قریب میں علم الرسم کے مسائل یونیورسٹی سطح پر ایم اے اور پی ایچ ڈی کے لیے مقالات کے موضوع بھی بنے ہیں' مثلاً:

۱) عبدالحی حسین الفرماوی نے ۱۹۷۴ء میں کلیہ اصول الدین جامعہ الازہر سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا موضوع تحقیق تھا: ''رسم المصحف ونقطه''۔

۲) غانم قدوری الحمد نے ۱۹۷۶ء میں کلیہ دارالعلوم جامعۃ القاہرہ سے ایم اے کی ڈگری جس مقالہ کی بنیاد پر حاصل کی' اس کا عنوان تھا ''رسم المصحف : دراسة لغوية تاريخية''۔ یہ مقالہ ایک کتاب کی شکل میں عراق کی ہجرہ کمیٹی کی طرف سے بھی شائع ہو چکا ہے اور اس موضوع پر بہت جامع اور کام کی کتاب ہے۔ مقالہ نگار نے اس سے بکثرت استفادہ کیا ہے۔

گزشتہ اوراق میں علم الرسم پر لکھی گئی پچاس کے قریب کتابوں کا ذکر آ گیا ہے (پیرا گراف ۱۱ تا ۱۴ میں)۔ یہ فہرست ذرا طویل لگتی ہے' تاہم اس علم کے ارتقاء کے بیان کے لیے کم از کم اہم کتابوں کا ذکر کیے بغیر بھی چارہ نہ تھا۔ دوسری طرف یہ فہرست علم الرسم پر لکھی گئی کثیر التعداد کتابوں کا ایک معمولی سا خاکہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس علم پر لکھی گئی تمام کتابوں کا شمار بھی ایک کارِ دشوار ہے اور یہ طویل سلسلہ تالیفات جو قریباً چودہ سو سال سے بغیر انقطاع کے جاری ہے' اس بات پر شاہد ہے کہ اس علم پر کتنی توجہ مرکوز کی گئی اور اس کی وجہ کو سمجھنا چنداں مشکل بھی نہیں ہے۔ آخر اس علم کا تعلق قرآن کریم کی درست کتابت سے ہے جو اسلامی معاشرے کی بنیادی دینی ضرورت ہے اور ایک مسلسل اور جاری عمل ہے۔

تاہم اس طویل فہرست میں سے علم الرسم کی اصل امہات الکتب صرف چار ہی شمار ہوتی ہیں' یعنی **المقنع' التنزیل' العقیلہ** اور **المنصف**۔ یا پھر وہ کتابیں جن کی تالیف ان کتب اربعہ سے استمداد پر مشتمل ہو' مثلاً ''**مورد الظمآن للخراز**'' یا ''**نثر المرجان**'' جو اس علم کی تمام کتابوں کی جامع ہے۔

باقی کتابوں کی حیثیت شرح یا تلخیص کی ہے یا پھر ترتیب وتبویب اور اسلوب وانداز کا فرق ہے۔

(جاری ہے)

حوالے اور حواشی

(۱) لبیب' ص ۲٤

(۲) یوسف علی (مقدمہ)' ص ۹

(۳) **مصحف (مثلث المیم)** کے معنی ہیں: **جامع المصحف**۔ اس اصطلاح کے اندر تدوین وجمع قرآن کی پوری داستان جھلکتی نظر آتی ہے (صحف اور مصحف کے معنی اور ان کے باہمی تعلق کی مزید وضاحت کے لیے دیکھئے: Denffer ص ۲۴ اور دلیل' ص ۱٦)۔ عہد خلافت راشدہ' خصوصاً عہد عثمانی سے لفظ ''مصحف'' نسخہ قرآن کے معنی میں استعمال ہوتا چلا آیا ہے' اس کی جمع ''مصاحف'' ہے۔ جہاں ''نسخہ ہائے قرآن'' کہنا ہو' اس کے لیے یہی لفظ (مصاحف) استعمال کرنا چاہیے۔ قرآن کی جمع ''قرآنوں'' یا ''قرآن ھا'' یا "Qurans" کا استعمال درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن متعدد نہیں بلکہ ایک ہی ہے۔

(۴) دلیل' ص ٤۰۔ سمیر' ص ۲۷۔ غانم' ص ۱۵۵

(۵) ''املاء'' بھی عربی لفظ ہے اور اس کے معنی ''لکھوانا'' (dictation) کے ہیں۔ تاہم اردو فارسی میں یہ لفظ انگریزی spelling کے مترادف ہے۔ عربی میں اس مقصد کے لیے لفظ ''**ھجاء**'' استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ عربی میں اسی لفظ کے کچھ اور معنی بھی ہیں۔

(٦) مذکورہ الفاظ میں سے ''**الکتابۃ، الخط، الزبر، السطر** اور **الرقم**'' سے افعال اور مشتقات قرآن کریم میں مستعمل ہوئے ہیں۔

(۷) مقدمہ' ج ۱' ص ۷۸٤

(۸) قلقشندی' ج ۳' ص ۱۷۲

(۹) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود کوئی مصحف نہیں لکھا تھا۔ یہ مصاحف (عثمانیہ) ان کے حکم سے تیار کرائے گئے تھے۔ اس

لیے ان کے طریق املاء کے لیے ''رسم عثمانی'' کی اصطلاح وجود میں آئی۔ جن لوگوں کو بوجوہ یہ اصطلاح پسند نہیں وہ رسم مصحف یا رسم قرآنی وغیرہ کہہ لیتے ہیں۔ مراد سب کی ایک ہی ہے یعنی ''علم الرسم''۔

(۱۰) تلخیص ‘ص ٥

(۱۱) المیسر (مقدمه) ص اوّل

(۱۲) دلیل ‘ص ٤٠۔ سمیر‘ ص ٣٠

(۱۳) تجزیہ روایات کے لیے دیکھئے: البری ‘ص ٤٣۔٤٥ اور غانم‘ ص ١٢٦

(۱۴) نیز دیکھئے Denffer ‘ص ۵۴۔۵۵‘ جہاں مراحلِ جمعِ قرآن کی ترتیب زمانی کو ایک سادہ مگر عمدہ چارٹ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

(۱۵) دلیل ‘ص ١٥۔١٦

(۱۶) البری‘ ص ٤٥ ببعد۔اور دلیل ص ١٨

(۱۷) البری ‘ص ٤٧

(۱۸) دلیل ‘ص ١٩

(۱۹) سمیر‘ ص ١٧

(۲۰) تفصیل کے لیے دیکھئے : غانم‘ ص ١٩٨ اور ص ٧٣٠

(۲۱) نخبه‘ ص ٢٣

(۲۲) یہی کتاب (نخبه) ص ٥٧۔٥٨

(۲۳) ابن درستویہ (ت ۳۴۶ھ) نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں یہ لکھا ہے کہ اس سے پہلے لوگوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق اصولِ املاء وضع کیے‘ جن میں بہت سے غلط بھی ہیں۔ اور یہ کہ اس نے اپنی کتاب کو قیاسِ نحوی سے زیادہ قریب کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھئے ابن د رستویه‘ ص ٦

(۲۴) ابن الندیم نے اس قسم کی کتابوں میں سے بعض کا ذکر کیا ہے‘ مثلاً ابو حاتم سجستانی کی کتاب الخط والهجاء (الفہرست‘ ص ۸۸)‘ ابن درستویہ کی کتاب المتمم اور کتاب الهجاء (الفہرست‘ ص ۹۴۔۹۵) اور الکسائی کی کتاب الهجاء (الفہرست‘ ص ۹۸) وغیرہ۔ اس قسم کی مزید کتابوں کے ذکر کے لیے دیکھئے: غانم ‘ص ٧٣١ ببعد۔

(۲۵) غانم‘ ص ١٩٨

(۲۶) اس زمانے تک پیشہ ورانہ اور فنی خطاطی کی طرف بھی پیش رفت شروع ہوگئی تھی۔ تابعین میں سے ابوحکیمہ‘ مطر اور مالک بن دینار کی عمدہ خطاطی اور (پیشگی طے کیے بغیر) اجرت پر مصاحف لکھنے کا ذکر ملتا ہے۔ دیکھئے : المصاحف ص ١٣٠۔١٣٢

(۲۷) الکردی ‘ص ١٣٣

(۲۸) یہ واقعہ علم الرسم کی قریباً تمام کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے‘ مثلاً دیکھئے : المقنع‘ ص ٩۔ الکردی‘ ص ١٠٣۔١٠٤۔ دلیل‘ ص ٢٣۔٢٤۔ غانم ‘ص ١٩٩ اور سمیر‘ ص ١٨

(۲۹) الخلیفة ص ٢‘ دلیل ص ٤١‘ سمیر ص ٢٧۔

(۳۰) اور اس زمانے میں لوگ خصوصاً اہل علم تعلیمی اور دینی و علمی اغراض کے لیے حرمین میں فی الواقع طویل قیام کیا

کرتے تھے۔ نہ تو آج کل کی طرح چالیس دن کے اندر حرمین سے نکل جانے کی پابندی تھی اور نہ ہی وہ لوگ خریداری (shopping) کے دلدادہ ہوتے تھے۔

(۳۱) اس قسم کے املائی اختلافات کی مزید یکجا امثلہ کے لیے دیکھئے: الفرقان، ص۶۴، الکردی، ص ۱۲۸۔۱۳۱، اور المیسر (مقدمہ) ص ''و''، ''ز'' اور ویسے تو علم الرسم کی ہر کتاب اسی قسم کے اختلافات کے بیان سے بھری پڑی ہے۔

(۳۲) اور اس کی بڑی وجہ غالباً اس بارے میں امام مالکؒ کا مشہور فتویٰ بھی تھا۔ افریقہ اور اندلس میں زیادہ تر فقہ مالکی ہی رائج ہوئی اور شمالی افریقہ کے ملکوں میں اب تک غالب اکثریت اسی مذہب (فقہ) کی پیرو ہے۔

(۳۳) تفصیل کے لیے دیکھئے، نامہ آستان ص ۱۵۔۱۹

(۳۴) ابن الندیم کے مذکورہ بالا حوالوں کے لیے دیکھئے: الفہرست، ص ٥٤، ص ٥٥ اور ص ۸۷۔

(۳۵) المقنع، ص ۲۲۔۲۳

(۳۶) غانم، ص ۱۷۲۔۱۷۳

(۳۷) دیکھئے المورد، ص ۲۷۱ تا ۳۱٦

(۳۸) الفہرست ص ۸۷، ۹۸، ۱۰۰ اور ۱۱۲

(۳۹) دلیل، ص ۲۵۔۲٦۔ اور غانم، ص ۱۷٤۔

(۴۰) غانم، ص ۱۵٦ جس میں لکھا ہے کہ ''ویظهر فيه نزوع شديد الى استخدام مادة رسم للدلالة خاصة على خط القرآن''

(۴۱) یہ کتاب غالباً طبع ہو چکی ہے، اگرچہ اشارہ واضح نہیں ہے۔ دیکھئے: المورد، ص ۴۱۳

(۴۲) دیکھئے ان مصاحف کے ضمیمہ ہائے ''التعریف''۔ مصری مصحف ص ''د'' سعودی مصحف ص ''ا'' اور لیبی مصحف ص ''ج'' اور ''و''۔

(۴۳) غانم، ص ۳۸۸ اور ص ۱۷۹۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے مخطوطہ میں کنیت ''ابن الطاہر'' اور باپ کا نام طاہر کی بجائے ''ظافر'' لکھا ہے اور کتاب کا نام ''**فی مرسوم خط المصحف مرتباً علی سُور القرآن الکریم**'' دیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے اسی مخطوطہ سے استفادہ کیا ہے۔

(۴۴) البرھان، ج ۱، ص ۳۸۰۔۴۳۰۔ نیز اس پر تنقید کے لیے دیکھئے: صبحی، ص ۲۷۷ اور المیسر (مقدمہ) ص ''ی'' و ''ک''، اور اس کی بعض تعلیلات پر تبصرہ کے لیے دیکھئے، الکردی، ص ۱۵۴۔۱۵٦

(۴۵) دیکھئے: المورد، ص ۴۱۳، ۴۳۲

(۴٦) ان چار مخطوطات میں سے نمبر ۲ (جامع الکلام.....) کا ذکر غانم قدوری نے اپنی کتابیات میں کیا ہے (غانم، ص ۷۸۹.....)۔ باقی کا ذکر مجلّہ **المورد العدد العاشر** ۱۹۸۱ء میں شائع ہونے والے ابتسام مرھون الصفار کے ایک تحقیقی مضمون بعنوان ''**معجم الدراسات القرآنية المطبوعه والمخطوطه**'' میں آیا ہے۔

(۴۷) تفصیل کے لیے دیکھئے: غانم، ص ۱۸۴۔۱۸۵

(۴۸) زرکلی نے اس کا نام ''**خميلة ارباب المقاصد**'' لکھا (زرکلی، ج ۱، ص ۴۹) اور غانم قدوری نے اپنی کتابیات میں اس مخطوطہ کا نام خمیلہ (جمیلہ) دونوں طرح لکھا ہے۔ علم الرسم میں الجعبری کے اپنے قصیدہ لامیہ ''**روضة الطرائف**'' کا الگ ذکر اوپر پیراگراف ۱۲ میں نمبر ۱۰ پر ہو چکا ہے۔

(۴۹) غانم، ص ۱۷۸

اسلام میں عورت کا مقام
اور میاں بیوی کے باہمی معاملات (۴)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان ☆

نکاحِ (زواج) مِسیار

اسلام میں نکاحِ ثانی کی شرائط اتنی سخت ہیں کہ عموماً پوری نہیں ہو پاتیں اور ادھوری شرائط کے تحت کی گئی دوسری شادی رحمت کی بجائے طرفین کے لیے سخت زحمت بن جاتی ہے' جیسے عدل نہ کرسکنا' نان ونفقہ کی ذمہ داری سے پہلوتہی یا مناسب رہائش مہیا نہ کرنا وغیرہ۔اور پھر محاسبہ آخرت تو ہے ہی۔اس سلگتے مسئلے کا حل بعض عرب علماء نے 'نکاحِ مسیار' کی صورت میں نکالا ہے۔ایسے نکاح میں مروّجہ نکاح کی تمام شرائط اور ارکان موجود ہوتے ہیں' جیسے ایجاب وقبول' گواہوں کی موجودگی اور مہر کی ادائیگی وغیرہ۔بس اس کے ساتھ ایک اور اضافی شرط اسے نکاحِ مسیار کی صورت دے دیتی ہے' اس طرح کہ شوہر کے مطالبے پر یا اپنی رضامندی سے عورت اپنے حقوق' نان ونفقہ' عدل' رہائش اور رات گزارنا وغیرہ میں سے کوئی ایک' دو یا سارے حقوق سے دستبردار ہو جائے۔واضح رہے کہ یہ نکاحِ موَقّت یا متعہ' جن میں وقت کا تعین ہوتا ہے اور ان کی حرمت پر اتفاق ہے' سے یکسر مختلف ہے۔نکاحِ مسیار میں نہ تو کوئی وقت مقرر ہوتا ہے اور نہ ہی ایسی کوئی ظاہری نیت ہوتی ہے۔

نکاحِ مسیار کے بنیادی محرکات

نکاحِ مسیار کے کئی ایک بنیادی محرکات یوں بیان کیے جاتے ہیں:

(ا) شادی کی عمر سے زائد پہنچ جانے والی عورتوں کی کثرت' مطلقات' بیوہ اور مخصوص حالات والی عورتوں کی تعداد بڑھنا۔(جیسے اچھی مالی حیثیت والی بیوہ اور مطلقہ عورتوں میں اضافہ وغیرہ)۔

(ب) بیشتر عورتیں تعددِ ازدواج کی مخالفت کرتی ہیں۔اس بنا پر خاوند اس طرح کی شادی کرنے پر مجبور ہوتا ہے تاکہ پہلی بیوی کو اس کی آگاہی نہ ہوسکے۔

(ج) مخصوص حالات میں بعض مَردوں کا عفت وعصمت کا حصول اور حلال فائدہ حاصل کرنے کی رغبت پیدا ہونا۔

☆ ریٹائرڈ صدر شعبہ اسلامیات ومطالعہ پاکستان' گورنمنٹ کالج آف کامرس' علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور

(د) ایسے نوجوان اور مرد جو مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کافی عرصہ سے غیر ممالک میں مقیم ہوں اور جنسی خواہشات وضروریات کے ناجائز ذرائع اور حرام کاری سے بچنا چاہیں۔

نکاحِ مسیار کی شرائط

زواجِ مسیار میں مروّجہ نکاح کی تمام شرائط اور ارکان موجود ہوتے ہیں' جیسے مہر کی ادائیگی' ولی کی اجازت' گواہوں کی موجودگی' ایجاب وقبول وغیرہ۔ ان شرائط کی موجودگی میں ایک اضافی شرط ہوتی ہے جو اسے نکاحِ مسیار بناتی ہے۔ وہ یہ کہ شوہر نکاح کے موقع پر یہ شرط لگائے کہ عورت اپنے حقوق' نان نفقہ' رہائش' عدل (رات گزارنا) وغیرہ میں سے کوئی ایک یا سارے حقوق چھوڑ دے۔ (۱)

فقہاء نے نکاح کی شرائط کو تین انواع میں تقسیم کیا ہے:

(ا) شرائطِ انعقادِ نکاح (ب) شرائطِ جوازِ نکاح (ج) شرائطِ لزومِ نکاح

انعقادِ نکاح کی پہلی شرط عقل' دوسری بلوغ اور تیسری رضامندی ہے۔ یہ وہ شرائط ہیں جن کا تعلق عاقدین نکاح سے ہے' جبکہ چوتھی شرط اتحادِ مجلس اور پانچویں مجلسِ عقدِ نکاح میں گواہوں کی موجودگی ہے (فقہاء کے نزدیک نکاح کے گواہوں کی کم از کم تعداد دو عاقل بالغ مرد ہیں)۔

مرد کے ذمہ نکاح کے حوالے سے دو اہم ترین فرائض عائد ہوتے ہیں:

(ا) مہر کی ادائیگی (ب) نان ونفقہ کی ادائیگی

اب اس کے بعد عورت کو اختیار ہے کہ وہ اپنا مہر مکمل یا اس کا کچھ حصہ واپس کر دے' یا پھر ادائیگی سے قبل ہی مہر کو کُلّی یا جزوی طور پر معاف کر دے۔ اسی طرح کوئی عورت بوجہ اچھی ملازمت یا اپنی مضبوط مالی حیثیت کے پیش نظر شوہر کو نان ونفقہ کی ادائیگی سے آزاد کر دے' تو اس سے نفس نکاح میں کسی قسم کا کوئی فساد پیدا نہیں ہوتا۔ (۲) صحاحِ ستّہ کی احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی تھی۔'' (۳)

اگر شرعی طور پر یہ جائز نہ ہوتا تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی اس کو تسلیم نہ کرتے۔ چنانچہ ہر وہ شرط جو محض نکاح کی جوہری غرض اور اصلی مقصد پر اثر انداز نہ ہوتی ہو' تو وہ شرط صحیح ہے۔ یہ نہ تو عقدِ نکاح میں مخل ہوتی ہے اور نہ ہی اسے باطل کرتی ہے۔

موجودہ دور میں عرب علماء شیخ عبدالعزیز بن باز' یوسف القرضاوی وغیرہ اور مجمع الفقہ الاسلامی نے نکاحِ مسیار کو (کراہت کے ساتھ) جائز قرار دیا ہے۔

مجمع الفقہ الاسلامی کے مکہ مکرمہ میں منعقدہ اٹھارہویں اجلاس میں درج ذیل قرارداد منظور کی گئی:

مجمع الفقہی اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ شادی کے نئے عقد' اگرچہ اس کے نام' اوصاف اور صورتیں مختلف ہیں' کو شریعت مطہرہ کے مقرر کردہ قواعد وضوابط کے تابع ہونا چاہیے۔ اور اس میں ارکان اور شروط پوری ہوں

اور (یہ) موانع سے خالی ہوں۔ عصر حاضر میں لوگوں نے بعض (ایسے) عقد شروع کر دیے ہیں، جن کے احکام ذیل میں ہیں۔

ایسا عقدِ زواج جس میں عورت رہائش، خرچ اور باری کی تقسیم یا کچھ دوسرے حقوق برضا و رغبت ختم کر دے۔ مرد دن رات میں جب چاہے، اس کے پاس آ سکتا ہو۔ اس میں ایسا عقد نکاح بھی شامل ہے کہ جس میں عورت اپنے گھر والوں کے ساتھ میکے میں ہی رہے اور زوجین جب چاہیں، عورت کے میکے یا کسی اور جگہ مل لیں (خلوت کر لیں)۔ اس طرح سے خاوند بیوی کو نہ تو رہائش اور نہ ہی خرچ (نفقہ) دے۔ یہ دونوں عقد اور اس طرح کے دوسرے عقد اس وقت صحیح ہوں گے، جب ان میں شادی کے ارکان اور شروط موجود ہوں اور کوئی مانع نہ پایا جائے، لیکن یہ خلافِ اولیٰ ہے۔

یہ ہمارے علم میں رہنا چاہیے کہ نکاح کی یہ صورت (نکاحِ مسیار) اگرچہ ایک مثالی اور مطلوبہ ضرورت نہیں، لیکن اس کے باوجود یہ اس وقت صحیح ہوگی جب اس میں شادی کی شروط اور ارکان پائے جائیں، جیسے (باہمی) رضامندی، ولی اور گواہوں کی موجودگی، یہی فتویٰ شیخ ابن باز نے دیا ہے۔ اس لیے کہ عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ شرعی طور پر مقرر کردہ اپنے سارے یا کچھ حقوق کو ساقط کر دے۔ اس سے نفس نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تاہم عام حالات میں ایسے نکاح کو بالکل پسندیدہ یا مستحسن بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن مخصوص حالات میں عفت و عصمت کے بچاؤ اور معاشرے میں زِنا کے سد باب کے لیے اس طرح کے نکاح کا جواز اور گنجائش نظر آتی ہے۔ واللہ اعلم!

حق مہر

نکاح کے لیے مہر کی ادائیگی بہت ضروری ہے اور اسے واجب قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اس کے لیے درج ذیل چار الفاظ استعمال ہوئے ہیں:

(ا) مال (ب) صدقہ (ج) اجر (د) فریضہ

محرماتِ نکاح کے تفصیلی ذکر کے بعد فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ .....﴾ (النساء:٢٤)

''اور ان کے سوا (سب عورتیں) تمہارے لیے حلال ہیں، اس طرح کہ تم اپنے اموال کے ساتھ (ان کو) نکاح میں لانا چاہو.....''

اس مال دینے کو اصطلاح میں مہر کہتے ہیں۔

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ﴾ (النساء:٤)

''اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے ادا کرو۔''

صَدُقَه یا صَدَاق مہر کو کہا جاتا ہے۔

مہر کی مستحق صرف آزاد عورتیں ہی نہیں بلکہ کنیزیں بھی ہوتی ہیں۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ......﴾ (النساء: ٢٥)

''پس ان (کنیزوں) سے ان کے مالکوں کی اجازت کے ساتھ نکاح کرو اور انہیں ان کے مہر حسب دستور ادا کرو......''

مسلمان عورتوں اور اہل کتاب کی پاک دامن عورتوں کے لیے فرمایا گیا:

﴿اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ (المائدۃ:۵)

''جب تم انہیں ان کے مہر ادا کرو۔''

مہر کا ادا کرنا چونکہ حکم خداوندی کے تحت ہے' اس لیے اس کے لیے **فریضة** کا لفظ بھی قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے:

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ﴾ (البقرۃ:٢٣٦)

''تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دو' جبکہ تم نے ابھی ان کو چھوا نہ ہو یا مہر مقرر نہ کیا ہو۔''

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ﴾ (النساء:٢٤)

''تو پھر جن عورتوں سے تم ازدواجی زندگی کا لطف اٹھاؤ تو ان کو دو ان کے مہر جو مقرر ہوئے ہیں۔''

مہر کا وجوب درج ذیل آیاتِ قرآنی سے ثابت ہے:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗـــــًٔا مَّرِيْۗـــــًٔا ۝۴﴾ (النساء)

''اور دے ڈالو عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے' پھر اگر وہ اس میں سے کچھ چھوڑ دیں اپنی خوشی سے تو اس کو کھاؤ مزیدار سمجھ کر خوش گواری سے۔''

سورۃ النساء کی آیت ۳۴ کے الفاظ ﴿وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ﴾ ''اور اس سبب سے کہ جو وہ (مرد) اپنے اموال خرچ کرتے ہیں'' بھی مہر کے واجب ہونے پر دلیل ہیں۔اسی طرح فقہاء نے آیت قرآنی ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ﴾ (الاحزاب: ۵۰) ''ہمیں خوب علم ہے جو ہم نے مقرر (لازم) کیا ہے مسلمانوں پر ان کی بیویوں کے بارے میں'' سے بھی مہر کا وجوب ثابت کیا ہے۔

مہر سے متعلق عرب میں کئی قسم کے ظلم ہوتے تھے:[۴]

(ا) مہر' جو لڑکی کا حق تھا' اس کو نہ دیا جاتا' بلکہ لڑکی کے اولیاء (سرپرست) شوہر سے وصول کر لیتے تھے۔اس زیادتی کو ختم کرنے کے لیے سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ﴾ ''اور ادا کرو عورتوں کو ان کے مہر''۔اس کے مخاطب شوہر بھی ہیں کہ وہ اپنی بیوی کا مہر خود بیوی کو دیں۔نیز اس میں لڑکیوں کے اولیاء سے بھی خطاب ہے کہ اگر لڑکیوں کے مہر ان کو وصول ہو جائیں یا وصول کر لیں' تو یہ لڑکیوں کو ہی ادا کریں۔ان کی اجازت اور قلبی رضامندی کے بغیر اپنے تصرف میں ہرگز نہ لائیں۔

(ب) اگر کبھی کسی کو مہر دینا ہی پڑ جاتا تو اسے وہ بہت غصے اور تلخی کے ساتھ' بادل نخواستہ' تاوان سمجھ کر دیتے تھے۔اس ظلم کا ازالہ آیت مذکور کے لفظ ''نِحْلَة'' سے فرمایا گیا۔لغت میں نِحْلَة اس عطیہ کو کہتے ہیں جو خوش دلی کے ساتھ بغیر کسی معاوضہ کی امید کے دیا جائے۔جیسا کہ بیضاوی میں تصریح ہے: **نحلة عطية اذا اعطاه ايّاه عن طِيب نفسٍ بلا توقع عوض۔**

(ج) بہت سے شوہر یہ سمجھ کر کہ بیوی مجبورِ محض ہے' مخالفت کر ہی نہیں سکتی' دباؤ ڈال کر اس سے مہر معاف کروا لیتے تھے۔اس سے درحقیقت معافی نہیں ہوتی' مگر وہ یہ سمجھ کر بالکل بے فکر ہو جاتے کہ اب تو حق مہر معاف ہو گیا ہے' دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔اس ظلم کے انسداد کے لیے آیت میں ارشاد ہوا: ﴿**فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا**﴾ (النساء:٤) ''اگر وہ عورتیں خوش دلی کے ساتھ اپنے مہر کا کچھ حصہ تمہیں دے دیں''۔مطلب یہ ہوا کہ زیادتی اور دباؤ کے ذریعے معافی حاصل کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا' اس سے درحقیقت کچھ بھی معاف نہیں ہوتا۔لیکن اگر وہ عورتیں کلی طور پر اپنے اختیار اور رضامندی سے مہر کا کچھ حصہ معاف کر دیں یا لینے کے بعد تمہیں واپس کر دیں' تو ایسی صورت میں وہ تمہارے لیے جائز اور درست ہوگا۔

مذکورہ مظالم زمانہ جاہلیت میں تو بہت زیادہ تھے' جن کا قرآن حکیم کی اس آیت میں انسداد ہوا' لیکن سخت افسوس' دکھ اور جہالت کی بات ہے کہ ان مظالم کا سلسلہ ابھی تک مسلمانوں میں جاری ہے۔مختلف قبیلوں' ذاتوں' خاندانوں اور علاقوں میں ان مظالم میں سے کچھ مظالم یا کوئی ظلم لازمی پایا جاتا ہے۔ایک مسلمان کو ان سب سے بچنا بہت لازم ہے۔

اس آیت میں جو طیب نفس کی قید لگائی گئی کہ تمہاری بیویاں اگر اپنی خوشی سے تمہیں مہر کا کچھ حصہ واپس کر دیں یا تم سے وصول ہی نہ کریں' تو تم اس کو بغیر کسی بوجھ کے کھا سکتے ہو' اس سے شریعت کے ایک بہت اہم ضابطے کا علم ہوتا ہے۔یہ بنیادی شرعی اصول ہے کہ کسی کا ذرا سا مال بھی کسی دوسرے کے لیے قطعاً حلال نہیں' جب تک کہ طیب نفس (خوش دلی) سے اس کی اجازت نہ دی گئی ہو۔ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ((**أَلَا لَا تَظْلِمُوْا، أَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِىءٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ**))(۵) ''خبردار! ظلم نہ کرو! خبردار! اچھی طرح سے سمجھ لو کہ کسی شخص کا مال (دوسرے شخص کے لیے) حلال نہیں ہے' جب تک کہ اس کے دل کی خوشی سے حاصل نہ ہو''۔اسی سے زبردستی کے چندے' عطیے اور ہدیے کا راستہ بھی رکتا ہے۔یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ اگر عورت خود نہ بھی مانگے تو اس سے حق مہر کی معافی نہیں ہو جاتی۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور قاضی شریحؒ کا فیصلہ ہے کہ کوئی عورت شوہر کو حق مہر معاف کر دے اور اگر پھر اس مہر کا مطالبہ کرے' تو شوہر کو ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا' اس لیے کہ یہ مطالبہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اس نے دل سے معاف نہیں کیا تھا۔

آج کل بہت سی عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ مہر ملنا تو ہے نہیں' اگر مانگوں یا معاف نہ کروں تو اس سے گھر میں غصہ' تناؤ' بدمزگی اور فساد پیدا ہوگا' تو بادل نخواستہ وہ اسے معاف ہی کر دیتی ہیں' حالانکہ شرع میں ایسی معافی کا قطعاً

کوئی اعتبار نہیں۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ صحیح معنوں میں طیب نفس سے معاف کرنے کا پتہ اس صورت میں چل سکتا ہے کہ مہر کی پوری رقم بیوی کے حوالے کر دی جائے۔ اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے بغیر کسی دباؤ یا ہتھکنڈے کے، تھوڑا یا زیادہ حصہ واپس کر دے۔ اس سے قطعاً یہ گنجائش نہیں نکلتی کہ بیوی کو حق مہر ادا ہی نہ کیا جائے اور ویسے ہی کسی لالچ یا جذباتی لمحے کی معافی کو کافی جان کر انسان بالکل مطمئن ہو جائے۔ یہ تو سراسر غصب کے زمرہ میں آتا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمان الٰہی ہے: ﴿فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝۴﴾ ''تو اس کو کھاؤ مزے مزے سے''۔ هَنِيْٓـًٔا اور مَّرِيْٓـًٔا دونوں فعیل کے وزن پر صفت کے الفاظ ہیں۔ هَنِيْٓـًٔا (مَنْ هَنَأَ وَهَنُؤَ وَهَنِئَ) لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مشقت اور تکلیف کے بغیر حاصل ہو جائے۔ جب یہ طعام کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی خوشگوار طعام کے ہیں۔ یعنی ایسا طعام (کھانا) جو کسی محنت اور تکلیف کے بغیر حلق سے اُتر جائے اور آسانی سے ہضم ہو کر جزوِ بدن بن جائے۔ مَرِيْٓـًٔا (مَنْ مَرأ الطَّعَامَ فَهُو مَرِیءٌ أَی هَنِئَ) کا لفظ بھی مذکورہ معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ (بحوالہ القاموس) غرضیکہ دونوں لفظ قریب المعنی ہیں، هَنَأَ، يَهْنِئُ اور مَرِئَ، يَمْرَؤُ سے مشتق اور مصدر کی جگہ رکھے گئے ہیں۔

آیت قرآنی میں صَدُقات کا لفظ آیا ہے، یہ صَدُقَة کی جمع ہے۔ صدُقه اور صَداق عورتوں کے مہر کو کہا جاتا ہے۔ ملا علی قاری مشکوٰۃ شریف کی شرح مرقاۃ میں لکھتے ہیں: مہر کو صَداق اور صَدُقة اس لیے کہا جاتا ہے کہ ص د ق کے اس مادہ میں سچ کے معنی ہیں اور مہر سے بھی چونکہ شوہر کا اپنی بیوی کی طرف سچا میلان ظاہر ہوتا ہے، اس لیے اس مناسبت سے مہر کو صَداق (صَدُقَة) کہنے لگے۔ (۶)

واضح رہے کہ مہر شریعت اسلامی میں بیوی کی کوئی قیمت نہیں، جسے اولیاء (سرپرستوں) کو دے کر شوہر اسے حاصل کرتا ہے، بلکہ حق مہر بطور ہدیہ، عطیہ اور نذرانہ کے ہے جو شوہر بغرضِ اکرام و اعزاز اور خوش دلی سے براہِ راست بیوی کے قدموں میں نچھاور کرتا ہے۔ ایسا اس لیے بھی چاہیے تاکہ یہ عمل اس مودت و انس اور محبت کی دلیل بن سکے، جس کا زندگی گزارنے کے لیے زوجین میں پایا جانا اشد ضروری ہے۔ اسی کو قرآن پاک میں ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط﴾ (الروم: ۲۱) ''اور اس نے تمہارے (زوجین کے) درمیان محبت اور ہمدردی رکھ دی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿اٰتُوا النِّسَآءَ﴾ فرما کر یہ ہدایت دی گئی کہ مہر کی رقم اپنی بیویوں کو ادا کرو، نہ کہ ان کے اولیاء اور والدین کو۔ ابن ابی حاتم نے ابوصالح سے روایت نقل کی ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی بچی کا نکاح کرتا تو اس کا مہر خود وصول کرتا، بچی کو مہر نہ دیا جاتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اور حدیث میں بھی ممانعت آ گئی۔ امام بغوی نے کہا کہ عورت کا ولی جب اس کی شادی کرتا، تو اگر وہ عورت قبیلہ میں ہی رہتی تو اس صورت میں اسے مہر میں سے کچھ بھی نہ دیا جاتا۔ اگر اس کا خاوند قبیلے سے باہر کا اجنبی ہوتا تھا تو ایک اونٹ پر سوار کر کے اسے خاوند

کے پاس بھیج دیا جاتا تھا اور مہر میں سے اسے کوئی چیز بھی نہ ملتی تھی۔

ابوعبیدہ نے کہا کہ نِحْلَة کا معنی ہے خوش دلی سے۔ یہ اٰتُوا فعل سے مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یا اٰتُوا فعل کے فاعل سے حال ہے یا صَدُقَات سے حال ہے۔ یعنی مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں مال دیا ہے اس میں سے دو نہ کہ کسی اور کے مال سے یا ایسے مال سے جس میں کوئی شبہ ہو۔ ابوعبیدہ نے کہا کہ نِحْلَه وہ مال ہوتا ہے جو معین اور معلوم ہو۔ جب یہ مہر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عورتوں کے لیے عطیہ ہے تو خاوندوں کے لیے اسے عورتوں کو ادا کرنا فرض ہو گیا۔ اس کو دیکھتے ہوئے قتادہ نے نِحْلَة کا معنی ''فریضہ'' کیا ہے۔ ابن جریر نے کہا کہ اس کا معنی ''معین فریضہ'' ہے۔ زجاج کے قبول اس کا مطلب ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیا ہوا'' ہے۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: انتحل فلان كذا۔ اس صورت میں نِحْلَة ماقبل فعل کا مفعول ہوگا یا پھر صَدُقَات سے حال ہوگا۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری کیا ہوا قانون ہے' اس لیے تم اس کی پیروی کرو۔ نفسًا، طِبْنَ کے اسناد سے تمیز ہے' یعنی اگر وہ خوش دلی سے تمہیں مہر میں سے کوئی چیز' حصہ یا رقم دیں۔ یہاں مبالغہ کے لیے طیب نفس کو فعل کی بنیاد بتایا گیا ہے۔ پھر فعل کو نفسهن سے اصحابِ نفوس کی طرف پھیرا ہے اور عن حرف جارہ صلہ ذکر کیا ہے' کیونکہ یہ تجافی اور تجاوز کا معنی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مِن بعضيه ذکر کرنے میں یہ حکمت کارفرما ہے کہ جو چیز تمہیں ہبہ کی گئی ہے اسی پر اکتفا کرو' اگرچہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو اور زیادہ یا تمام کی خواہش کرنا چھوڑ دو۔ (۷)

﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ﴾ سے واضح ہوتا ہے کہ بیویوں کی طرف سے مہر کے حصے کی واپسی بغیر کسی جبر اور دباؤ کے ہونی چاہیے۔ اور شوہر کی طرف سے کسی مکر و فریب' حیلہ یا لالچ کا سہارا نہ لیا جائے' یا دھوکے سے اشٹام پر انگوٹھا نہ لگوایا جائے۔ ایسی صورت میں قاضی یا عدالت کی طرف سے کوئی بھی فیصلہ ہو' اللہ کے نزدیک وہ معاف نہیں سمجھا جائے گا اور شوہر کے لیے اس کا استعمال کرنا جائز نہ ہوگا۔

عورت کی طرف سے معافی پورے مہر کی بھی ہو سکتی ہے اور اس کے کسی جزو کی بھی۔ بیوی اگر شوہر سے مہر وصول کر کے پھر اسے واپس کر دے تو یہ ''ہبہ'' کہلائے گا اور اگر لیے بغیر پہلے ہی معاف کر دے تو اسے اصطلاحِ فقہ میں ''اہداء'' کہتے ہیں۔ شرعاً دونوں صورتیں درست ہیں۔

زیادہ مہر کے لیے شریعت میں کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔ مشہور واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اس کے لیے چالیس اوقیہ کی انتہائی حد مقرر کرنا چاہی تو اس پر ایک عورت نے انہیں ٹوک کر کہا کہ آیت قرآنی ﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا﴾ (النساء: ۲۰) ''اگر تم نے عورتوں کو ڈھیر سارا مال بھی دیا ہو' تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو'' کی رو سے آپ کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس دلیل کو سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: اِمْرَأَةٌ اَصَابَتْ وَرَجُلٌ أَخطَأَ ''ایک عورت نے صحیح بات کہی اور مرد غلطی کر گیا''۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد مقرر نہیں۔ (۸)

مہر کی کم از کم مقدار کے لیے امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا قول ہے کہ یہ شرعاً مقرر ہے اور یہ مال کی وہ مقدار ہے کہ جس پر چور کا ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے۔ اس کی مقدار میں دونوں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام اعظم کے نزدیک یہ مقدار دس درہم یا ایک دینار ہے اور امام مالک کے نزدیک یہ دینار کا چوتھائی حصہ یا تین درہم ہے۔ دونوں نے اپنا نقطہ نظر سورۃ الاحزاب کی اس آیت ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْ اَزْوَاجِهِمْ﴾ سے ثابت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں فرض کا معنی تقدیر ہے۔ پس مہر شرع کی طرف سے معین ہے اور جس نے اسے معین نہ کیا' وہ کتاب اللہ کے حکم کو باطل کرنے والا ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں تقدیر کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے اور اسے بندے کے سپرد نہیں کیا گیا۔ صاحب ہدایہ' شیخ الاسلام ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی' کتاب النکاح میں احناف کی دلیل پر یہ حدیث لائے ہیں: وَلَا مَهر اَقلّ مِن عَشرة ''اور دس درہم سے کم مہر نہیں۔''(۹)

دوسری دلیل یہ ہے کہ شریعت نے حق مہر اس لیے واجب کیا ہے کہ عورت کے شرف و احترام کا اظہار ہو' تو پھر اس کا اندازہ اور مقدار کم از کم اتنی تو ہونی چاہیے جو موزوں اور مناسب لگے۔ البتہ احادیث میں زوجین کی رضامندی پر اس سے کم مہر بھی نکاح میں ثابت ہے۔ مہر سے متعلق حضور کریم ﷺ کی واضح حدیث ہے:

عَنْ اَبِیْ سَلَمة قَالَتْ :سَاَلْتُ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ كَمْ كَانَ صَدَاقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ؟ قَالَتْ : كَانَ صَدَاقُهٗ لِاَزْوَاجِهٖ ثِنْتَیْ عَشْرَةَ اُوقِيَّةً وَنَشًّا ' قَالَتْ : أَتَدْرِیْ مَا النَّشُّ؟ قُلْتُ :لَا' قَالَتْ : نِصْفُ اُوْقِيَّةٍ فَتِلْكَ خَمْسُ مِائَةِ دِرْهَمٍ (۱۰)

''حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں' میں نے زوجہ رسول ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کا مہر (اپنی ازواج کے لیے) کتنا تھا؟ انہوں نے فرمایا: بارہ اوقیہ اور نش۔ (پھر) پوچھا: کیا تم جانتے ہو نش کیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ (تو حضرت عائشہؓ نے) فرمایا: نصف اوقیہ' پس یہ پانچ سو درہم ہوئے۔''

احادیث صحیحہ سے البتہ یہ واضح ہے کہ مہر کے بڑھانے میں مبالغہ کرنا اور مرد کی قوتِ برداشت سے زیادہ مہر رکھنا/رکھوانا ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔ حضرت حسن بصریؒ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((اَلْزِمُوا النِّسَاءَ الرِّجَالَ وَلَا تُغَالُوْا فِی الْمُهُوْرِ)) (۱۱)

''عورتوں کو مردوں کے پلے باندھنے (نکاح کرنے) کی کوشش کرو اور مہر میں حد سے نہ بڑھو۔''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اَعْظَمَ النِّسَاءِ بَرَكَةً اَيْسَرُهُنَّ مَؤُوْنَةً)) (۱۲)

''یقیناً برکت کے لحاظ سے عظیم ترین عورتیں وہ ہیں جو (مہر اور نان نفقہ کے) اخراجات کے لحاظ سے سب سے زیادہ آسانی والی ہوں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ((خَيْرُ النِّسَاءِ اَيْسَرُهُنَّ صَدَاقًا))(۱۳) کی رو سے بہترین عورتیں وہ ہیں جن کے مہر میں (ان کے شوہروں کو) سہولت ہو۔ مزید ارشاد مبارک ہے:

''مبارک عورت وہ ہے جس سے منگنی کرنا آسان ہو' جس کا مہر دینا آسان ہو اور جس کے ساتھ حسن سلوک کرنا آسان ہو۔'' (۱۴)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

لَا تُغَالُوْا صَدُقَةَ النِّسَاءِ، فَاِنَّهَا لَوْ كَانَتْ مُكَرَّمَةً فِي الدُّنْيَا اَوْ تَقْوًى عِنْدَ اللّٰهِ لَكَانَ اَوْلَاكُمْ بِهَا نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ، مَا عَلِمْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَكَحَ شَيْئًا مِنْ نِسَائِهٖ وَلَا اَنْكَحَ شَيْئًا مِنْ بَنَاتِهٖ عَلٰى اَكْثَرَ مِنْ اِثْنَتَيْ عَشْرَةَ اُوْقِيَّةً (۱۵)

''دیکھو! عورتوں کے مہر زیادہ نہ بڑھایا کرو' کیونکہ اگر یہ دنیا میں عزت کا موجب اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقویٰ کی چیز ہوتی تو نبی کریم ﷺ تم سے زیادہ اس کے مستحق تھے۔ مجھے علم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کسی سے بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر پر نکاح کیا ہو یا اپنی صاحبزادیوں میں سے کسی کا نکاح اس سے زیادہ مہر پر کیا ہو۔''

حضور پاک ﷺ نے اپنی کسی بیوی اور بیٹی کا مہر پانچ سو درہم سے زیادہ مقرر نہیں کیا' اور یہ ایک سو اکتیس تولے اور تین ماشے چاندی بنتی ہے۔ اس کو ''مہر فاطمی'' بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں روپے میں اس کا حساب وقت کے نرخ کے مطابق ہوگا۔ فقہ حنفی میں مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم (تقریباً دو تولے اور ساڑھے سات ماشے چاندی) ہے' اس سے کم مقرر کرنا صحیح نہیں۔ یہ جو بتیس یا سوا بتیس روپے کو ''مہر شرعی'' سمجھا جانے لگا ہے' یہ بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ (۱۶)

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مہر مقرر کر کے اس کے ادا نہ کرنے کی نیت پہلے سے ہی رکھی جائے' تو یہ فسادِ نکاح ہے اور عند اللہ یہ صحیح نہ ہوگا۔ البتہ مہر انعقادِ نکاح کے لیے شرط نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً عَلٰى صَدَاقٍ وَهُوَ يَنْوِيْ اَنْ لَا يُؤَدِّيَهُ اِلَيْهَا فَهُوَ زَانٍ)) (۱۷)

''جو شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور مہر ادا کرنے کی نیت نہ رکھتا ہو' وہ زانی ہے۔''

اسی طرح ایک دوسری حدیث کا مضمون ہے کہ جس شخص نے تھوڑے یا زیادہ جس قدر مہر پر بھی کسی عورت سے نکاح کیا اور دل ہی دل میں یہ تہیہ کر لیا کہ بیوی کے اس حق کو ادا نہیں کرے گا' تو یہ اس کو دھوکہ دینا ہوگا۔ اور اگر اس نے اس حق کو ادا نہ کیا اور مر گیا تو قیامت کے روز خدا کے سامنے زنا کار کے روپ میں پیش ہوگا۔ (۱۸)

البتہ اگر نکاح کے وقت مہر متعین نہیں ہو پایا' تو مجامعت کی صورت میں ''مہر مثل'' لازم ہوگا۔ یعنی اس خاندان میں عموماً لڑکیوں کا جتنا مہر رکھا جاتا ہے' اتنا ادا کرنا لازم ہے۔ اگر مرد مہر ادا نہیں کرتا اور شرعی طریقے سے وہ معاف بھی نہیں ہوا' اس صورت میں وہ مرد کے ذمے قرض ہے اور واجب الادا رہے گا۔ انتقال ہونے پر پہلے مہر کی ادائیگی ہوگی' پھر ترکہ تقسیم کیا جائے گا۔

اسی طرح مہر نقدی کی صورت میں دینا بھی ضروری نہیں' بطور زیور بھی ادائیگی ہو سکتی ہے۔ فوری گنجائش نہ

ہونے کی وجہ سے قسطوں پر بھی مہر باہمی رضامندی سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر میاں بیوی کے ملاپ سے پہلے بیوی فوت ہو جائے' تو خاوند کے ذمے نصف مہر واجب الادا ہے۔ اور اگر خلوت صحیحہ کے بعد اس کا انتقال ہوا تو شوہر کو پورا مہر دینا لازم ہے۔ (۱۹) مہر اگر نکاح کے وقت فوری ادا نہیں کیا گیا' تو بعد میں زوجین کی باہمی رضامندی سے کم وبیش کیا جا سکتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ﴾ (النساء:۲۴)

''اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ مہر مقررہ کے بعد تم آپس میں (اس کی کمی بیشی پر) رضامند ہو جاؤ۔''

اگر نکاح کے بعد صحبت / خلوت صحیحہ سے قبل طلاق ہو جائے' اور مہر متعین نہیں ہوا تھا' تو خاوند کو پھر بھی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ عطیہ ضرور دینا ہوگا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرۃ:۲۳۶)

''صاحبِ حیثیت اپنی وسعت کے مطابق اور تنگ دست اپنی توفیق کے مطابق حسبِ دستور (ان عورتوں کو) کچھ سامان ضرور دے۔''

قرآن پاک نے اس عطیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی' البتہ اتنا واضح کر دیا ہے کہ یہ مرد کو اپنی حیثیت کے مطابق بخوشی دینا چاہیے۔ اس میں یہ ترغیب موجود ہے کہ صاحب حیثیت تنگی سے کام نہ لے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ایسے ایک واقعہ میں بیس ہزار کا عطیہ دیا اور قاضی شریح نے پانچ سو درہم کا۔ اس ضمن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ کم از کم ایک (اچھا اور مکمل) جوڑا کپڑے کا ضرور دے۔ (۲۰)

اور اگر مہر متعین ہو چکا تھا تو (اس صورت میں) اس کا نصف ادا کرنا لازم ہے' البتہ عورت اپنا حق مہر چھوڑنا چاہے تو اسے اختیار ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ ......﴾ (البقرۃ:۲۳۷)

''اور اگر تم ان کو طلاق دے دو' اس سے پہلے کہ تم نے ان کو چھوا ہو' اور تم ان کے مہر مقرر کر چکے ہو تو مقرر کیے ہوئے کا آدھا ادا کر دو' مگر یہ کہ وہ (بیویاں) معاف کر دیں......''

البتہ پسندیدہ امر یہی ہے کہ خاوند پورا مہر بخوشی ادا کر دے۔

ادائیگی کے لحاظ سے مہر کی دو اقسام ہیں: (ا) مہر معجّل (ب) مہر غیر معجّل (مؤجل)۔ مہر معجّل کی فوری ادائیگی لازمی ہے اور اس کے ادا نہ کر سکنے کی صورت میں عورت اپنے نفس کو مرد سے روک سکتی ہے۔ نکاح میں مہر معجّل مقرر کرنا ہی افضل ہے۔ مہر غیر معجّل ایک مدت کے بعد ادا کرنا ہوتا ہے اور یہ عرصہ متعین ہونا چاہیے۔ اس مدت متعینہ سے پہلے عورت کو طلب کرنے کا اختیار نہیں۔ مہر ''عند الطلب'' طے ہونے پر' عورت جب بھی مانگے' ادا کرنا ضروری ہوگا۔

فی زمانہ مہر کی ادائیگی میں بہت تساہل برتا جا رہا ہے اور اس کی ادائیگی کی کوئی فکر ہی نہیں کی جاتی۔ بیوی کو

تحائف تو دیے جاتے ہیں اور شاپنگ کے حوالے سے اس کے ناز نخرے بھی بخوشی برداشت ہوتے ہیں، لیکن حق مہر کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ یوں اس کی ادائیگی کا بوجھ سر پر رہتا ہے، اور آخرت میں بھی اس بارے لازمی جواب دہی ہوگی۔ اس مسئلے کا ایک آسان حل یہ ہے کہ شادی میں بیوی کو جو بھی زیورات، منہ دکھائی اور ہدایا وغیرہ دیے جائیں، انہیں مہر میں شمار کر لیا جائے۔ اس طرح سے اس فریضہ کی ادائیگی بسہولت ہو سکتی ہے۔

(نان و) نفقہ

اسلامی قانون میں ازدواجی زندگی کے لیے جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے، اس کے مطابق شوہر پر بیوی کو مہر کے ساتھ نفقہ کی ادائیگی بھی لازم ہے۔ عورت کا کام جہاں گھر کی نگرانی اور خانگی فرائض سرانجام دینا ہے، وہیں مرد کے ذمے اپنے اہل وعیال کے لیے ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا بھی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ﴾ (النساء: ٣٤)

''مرد عورتوں پر منتظم ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ وہ اپنے اموال میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ﴾ (آیت ۲۳۳)

''اور جس کا لڑکا ہے (یعنی باپ) اس پر ان عورتوں (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا ہے دستور کے موافق۔''

اسی طرح فقہاء نے سورۃ الاحزاب کی آیت ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ (آیت ۵۰) ''ہم کو معلوم ہے جو مقرر کر دیا ہے ہم نے اس پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے حق میں'' سے بھی وجوبِ نفقہ ثابت کیا ہے۔

عورت کے نفقہ کی مقدار کے حوالے سے ہدایت ربانی ہے:

﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ؕ﴾ (الطلاق:٧)

''تاکہ خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق اور جس (شخص) پر رزق تنگ ہو تو وہ اس میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت اور قدرت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا۔''

احادیث رسول ﷺ میں بھی ہمیں نان ونفقہ کے حوالے سے تعلیم دی گئی ہے۔ ذیل میں چند احادیث مبارکہ بیان کی جاتی ہیں:

☆ ((وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ)) (٢١)

''اور تمہارے ذمے مناسب طریقے سے ان (ازواج) کے کھانے پینے اور کپڑے کا بندوبست کرنا ہے۔''

☆ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ بیوی کا کیا حق ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

((اَنْ تُطْعِمَهَا اِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوْهَا اِذَا اكْتَسَيْتَ))(۲۲)

''یہ کہ جب تو کھائے' اسے (بیوی کو) بھی کھلائے اور جب تو پہنے تو اسے بھی پہنائے۔''

☆ ((اِذَا اَنْفَقَ الْمُسْلِمُ نَفَقَةً عَلٰى اَهْلِهٖ وَهُوَ يَحْتَسِبُهَا كَانَتْ لَهٗ صَدَقَةً))(۲۳)

''جب مسلمان اپنے گھر والوں پر آخرت میں اجر پانے کی نیت سے خرچ کرتا ہے' تو یہ اس کے لیے صدقہ بنتا ہے۔''

☆ ((دِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَدِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِيْ رَقَبَةٍ، وَدِيْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهٖ عَلٰى مِسْكِيْنٍ، وَدِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰى اَهْلِكَ، اَعْظَمُهَا اَجْرًا الَّذِيْ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰى اَهْلِكَ))(۲۴)

''ایک دینار تو وہ ہے جو تو نے جہاد کے سلسلہ میں خرچ کیا' ایک دینار وہ ہے جس سے غلام کو آزادی دلانے میں مدد کی' ایک دینار وہ ہے جو کسی غریب مسکین پر خرچ کیا اور ایک دینار وہ ہے جو اپنے اہل وعیال (بیوی بچوں) پر خرچ کیا' یہ (دینار) اجر میں ان سب سے بڑھ کر ہے۔''

☆ ((مَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حَلَالاً اِسْتِعْفَافًا عَنِ الْمَسْأَلَةِ وَسَعْيًا عَلٰى اَهْلِهٖ وَتَعَطُّفًا عَلٰى جَارِهٖ لَقِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَوَجْهُهٗ مَثَلُ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ))(۲۵)

''جس شخص نے حلال ذرائع سے دنیا طلب کی تاکہ خود کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچائے رکھے اور اپنے اہل وعیال کے لیے روزی مہیا کرے اور اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرے' وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کا چہرہ بدرِ کامل کی طرح چمک رہا ہوگا۔''

گویا گھر کی ضروریات اور بیوی بچوں کی کفالت شوہر کی ذمہ داری ہے۔ یہاں یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ بیوی شوہر سے نان ونفقہ لینے کی اُس وقت تک مستحق ہے جب تک وہ اپنے شوہر کے گھر آباد ہو۔ اگر وہ بغیر کسی شرعی حق کے شوہر کی اجازت اور منشا کے بغیر اپنے میکے بیٹھ جائے تو وہ شرعاً ناشزہ (نافرمان) ہے اور ناشزہ کا نان ونفقہ شوہر کے ذمے واجب نہیں۔

اب نان ونفقہ میں نزاع کی دو صورتیں ہیں: پہلی یہ کہ شوہر نفقہ دینے کی استطاعت رکھتا ہو اور نہ دے' اور دوسری یہ کہ اس میں اس کے ادا کرنے کی قدرت ہی نہ ہو۔ پہلی صورت میں تو یہ امر متفق علیہ ہے کہ قاضی اس کو نفقہ ادا کرنے پر ہر ممکن طریقے سے مجبور کرسکتا ہے' لیکن اگر شوہر اس کے حکم کی تعلیم نہیں کرتا تو اب اختلاف ہے کہ ایسی صورت حال میں کیا کرنا چاہیے۔ احناف کا مسلک یہ ہے کہ ایسی صورت میں عورت خود اپنے نفقے کا بندوبست کرے' خواہ اسے شوہر کے نام پر قرض لینا پڑے یا محنت مزدوری کرنی پڑے' یا پھر اپنے کسی عزیز اور رشتہ دار سے مدد لینا پڑے۔ جبکہ اس کے برخلاف مالکیہ کا مسلک ہے کہ ایسی صورت میں مجبوراً قاضی کو خود طلاق واقع کردینے کا حق حاصل ہے۔ بعض علمائے احناف نے بھی مالکیہ کے اس فتوے کو اختیار کیا ہے' مگر اس شرط کے ساتھ کہ عورت خود نفقہ کا انتظام نہ کرسکتی ہو یا اگر کرسکتی ہو تو شوہر سے علیحدہ رہنے کی صورت میں اس کے معصیت میں مبتلا ہونے کا ڈر ہو۔ لیکن قرآن پاک کی رو سے نفقہ عورت کا حق ہے' جس کے معاوضے میں ہی

شوہر کو اس پر حقوقِ زوجیت حاصل ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص قصداً اس حق کو ادا کرنے سے انکاری ہے تو عورت کو زبردستی اس کے عقدِ نکاح میں رکھنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔ جب تک عورت کسی شخص کے نکاح میں ہے' اس کے نان ونفقہ کا ذمہ دار اس کا شوہر ہی ہے۔ حالت نکاح میں اس کو خود روزی کمانے' اپنے رشتہ داروں پر بار ڈالنے یا ایک ظالم شوہر کے نام پر قرض لینے کی غیر ممکن الحصول کوشش پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری صورت ''عدمِ استطاعت'' میں احناف کا پھر یہی مسلک ہے کہ عورت کو صبر کی تلقین کی جائے یا پھر وہ کسی عزیز کی مدد اور قرض وغیرہ پر گزارا کرے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی عورت کا نفقہ ہر اُس شخص پر واجب ہے جس پر بن بیاہی ہونے کی بنا پر اس کی پرورش اور گزارے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہو۔ لیکن امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کا موقف ہے کہ اگر عورت ایسے شوہر کے ساتھ زندگی نہ گزار سکتی ہو اور علیحدگی کا دعویٰ کرے' تو پھر علیحدگی (تفریق) کرا دی جائے گی۔ امام مالک کے نزدیک شوہر کو مہینہ' دو مہینہ یا مناسب مدت تک مہلت دی جائے گی کہ وہ نان ونفقہ کا بندوبست کر سکے' امام شافعی صرف تین دن کے انتظار کا کہتے ہیں اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک بلا تاخیر زوجین میں تفریق کرا دی جائے گی۔

اس حوالے سے قرآن پاک کا قاعدہ جو ﴿وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ﴾ میں بیان ہوا ہے' نہ صرف ائمہ ثلاثہ کی تائید کرتا ہے' بلکہ احادیث وآثار کی رو سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ دار قطنی اور بیہقی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ منقول ہے کہ عدمِ نفقہ کی صورت میں زوجین میں علیحدگی کرا دی جائے۔ حضرت عمر' حضرت علی اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہی منقول ہے۔ تابعین میں سے یہی حضرت سعید بن مسیّبؒ کا فتویٰ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عمل ہے۔ احناف کا استدلال آیت قرآنی ﴿وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ؕ﴾ سے ہے۔ حالانکہ اس آیت سے تو اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نفقہ کے لیے شرعاً کوئی مقدار مقرر نہیں' بلکہ اس کا انحصار نفقہ دینے والے (شوہر) کی مالی حیثیت پر ہے۔ اس سے یہ مطلب تو نہیں نکلتا کہ جہاں ادائیگیٔ نفقہ سرے سے موجود ہی نہ ہو' وہاں عورت کو زبردستی رہنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ مقامِ عزیمت اور اخلاقی کمال تو ہو سکتا ہے کہ ایک عورت فاقہ کشی' مصیبت یا تنگی اور آزمائش کے باوجود اپنے شوہر کا ساتھ دے' لیکن اسے کسی صورت شرعی مجبوری کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اخلاقی تعلیم اور شرعی حق کا علیحدہ علیحدہ مقام ہے۔ اگر عورت اپنے نفقہ کا حق برضا ورغبت چھوڑ دے یا چھوڑ سکتی ہو اور شوہر کی رفاقت کو ہی پسند کرے' تو واقعی قابلِ تعریف اور لائق تحسین ہے' لیکن اگر نان ونفقہ کے بغیر اس کا گزارا نہ ہو اور اس کے چھوڑنے کی استطاعت نہ پائی جاتی ہو' تو پھر اسلام کے نظامِ عدل وانصاف میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ اس کو تکلیف اور جبر کے ساتھ مقامِ عزیمت پر ٹھہرانے کی کوشش کی جائے۔ اس ضمن میں امام مالک کا مسلک سب سے احسن ہے کہ شوہر کو مناسب مدت تک مہلت دینے کے بعد ہی زوجین میں علیحدگی اور تفریق کا حکم دیا جائے۔ (۲۶)

اسی طرح مطلقہ حاملہ کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ﴾ (الطلاق:٦)

''اور اگر مطلقہ عورتیں حمل والیاں ہوں تو اُس وقت تک ان کا نفقہ ادا کرتے رہو جب تک انہیں وضع حمل نہ ہو جائے۔''

اسی لیے مطلقہ حاملہ کے بارے میں پوری اُمت کا اجماع ہے کہ اس کا نفقہ اس کی عدت (وضع حمل تک) پوری ہونے تک شوہر پر واجب ہے۔ اب جو مطلقہ حاملہ نہیں اور اس کو طلاق رجعی دی گئی ہے' تو عدت پوری ہونے تک اس کے نفقہ کا شوہر پر واجب ہونے پر بھی اجماعِ اُمت ہے۔ باقی رہی وہ مطلقہ جس کو طلاقِ بائن یا طلاقِ ثلاثہ دی گئی ہے یا اس نے خلع لیا ہے تو اس صورت میں امام شافعیؒ' امام احمد اور بعض دوسرے ائمہ کا قول ہے کہ اس کا نفقہ شوہر پر دورانِ عدت واجب نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا نفقہ بھی شوہر پر واجب ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح حقِ سُکنیٰ (رہائش) تمام مطلقات کے لیے لازم (واجب) ہے' اسی طرح حقِ نفقہ بھی تمام مطلقات کے لیے لازم ہے۔ ان کی دلیل مذکورہ بالا آیت کا پہلا حصہ ہے:

﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ﴾ (الطلاق:٦)

''ان عورتوں کو گھر (رہائش) دو رہنے کے واسطے جہاں تم رہو' اپنے مقدور (حیثیت) کے مطابق۔''

اس میں تمام مطلقات کے لیے حق سکنی لازم (واجب) ٹھہرایا گیا ہے۔

اس آیت کی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یوں ہے:

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ وَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ مِنْ وُّجْدِكُمْ

ایک قراءت دوسری قراءت کی تفسیر کرنے والی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ کی مشہور قراءت جس میں لفظ اَنْفِقُوْا مذکور نہیں' اس میں بھی گویا یہ لفظ محذوف ہے اور اس نے جس طرح تمام مطلقات کا حقِ سُکنیٰ شوہروں پر لازم کیا ہے' اسی طرح ایامِ عدت کا حق نفقہ بھی ان پر واجب کر دیا ہے۔ اس کی تائید حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دوسرے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس قول سے ہوتی ہے' جس میں انہوں نے حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی' جن کو ان کے شوہر نے طلاقِ ثلاثہ دی تھی' اس روایت کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نفقہ ان کے شوہر پر لازم نہیں کیا تھا' یہ کہہ کر ردّ فرمایا کہ ہم ایک عورت کے قول (روایت) کی بنا پر کتاب اللہ اور سنتِ رسول کو نہیں چھوڑ سکتے' جس میں تمام مطلقات کا نفقہ شوہروں پر واجب کیا گیا ہے (صحیح مسلم)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے قول کو ردّ کیا ہے۔ (۲۷)

اس روایت میں کتاب اللہ کے حوالے سے بظاہر یہی آیت مراد ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک مفہومِ آیت میں نفقہ بھی داخل ہے' جبکہ سنتِ رسول سے مراد وہ حدیث ہے جو خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے طحاوی' دار قطنی اور طبرانی میں روایت کی گئی ہے۔ آپؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقہ ثلاثہ کے لیے بھی نفقہ اور سکنیٰ واجب کیا ہے۔

تفسیر ابن کثیر کے مطابق ضحّاک کا قول ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے اور اس کے ساتھ چھوٹا

بچہ بھی ہو' تو اس کے دودھ پلانے تک (دوسال کا) خرچہ اور نفقہ باپ پر واجب ہے۔ اب گویا عدت کے دوران حمل والی عورت کا نان ونفقہ تو صراحتاً اس آیت نے واجب قرار دے دیا۔ اسی طرح مطلقہ رجیعہ کا چونکہ ابھی تک شرعاً نکاح نہیں ٹوٹا' اس لیے اس کے نفقہ کے وجوب پر بھی اتفاق ہے۔ مطلقہ بائنہ یا ثلاثہ کے معاملے میں فقہائے اُمت کا اختلاف ہے۔ احناف کے مسلک میں اس کا نفقہ بھی واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ کا ظاہر روایت میں قول ہے کہ بالغہ بچی اور اپاہج (معذور) بالغ بچے نیز نابالغ بچے کا نفقہ باپ پر واجب ہے۔ اسی طرح بوڑھے والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہے[۲۸]۔ امام مالک کا قول ہے کہ والدین کا نفقہ صلبی اولاد پر (واجب) ہوتا ہے۔ اس میں مذکر ومؤنث دونوں برابر ہیں' بشرطیکہ دونوں خوشحال ہوں۔ اور اگر ان میں سے ایک خوشحال ہو اور دوسرا فقیر (بدحال) ہو' تو نفقہ خوشحال پر لازم ہوگا۔[۲۹] احناف کے نزدیک نان ونفقہ کے حوالے سے شوہر کی مالی حیثیت کو ہی مدنظر رکھا جائے گا۔

والدہ اور بیوی کے درمیان خرچہ کی تقسیم

آخر میں ایک معرکۃ الآرا عائلی مسئلے' جس میں اکثر افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے' کی طرف توجہ مبذول کرانی مقصود ہے۔ یہ قضیہ والدہ اور بیوی کے درمیان خرچے کی تقسیم کا ہے۔ اس میں یا تو والدہ مکمل طور پر بااختیار اور حاوی ہو کر بہو کو اپنا محتاج بنا دیتی ہے' یا پھر بہو اپنی حکمرانی کا سکّہ جماتے ہوئے ساس کو مالی ضروریات کے حوالے سے ترساتی ہے۔ رہ گیا بے چارہ شوہر' تو وہ غریب چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستا رہتا ہے۔ اس حوالے سے اسلام ہمیں اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔ مرد کو چاہیے کہ وہ والدین کی ضروریات کو بھی حتی المقدور پوری کرے اور بیوی بچوں کی بھی حسب استطاعت کفالت کرے' کسی کی بھی حق تلفی نہ ہونے پائے۔

اس ضمن میں کتاب ''الزوج الصالح'' (صالح خاوند) سے ایک اقتباس توجہ کا اشد طالب ہے:

''بعض اوقات شوہر اپنے والدین کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے کہ بیوی فضول خرچ اور پھوہڑ ہے' گھر کے مناسب اخراجات سے بھی ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ یہ بات قابل اصلاح ہے۔ پہلے والے وقت لد گئے۔ والدین کے زمانہ میں گھر کے اخراجات پر جو رقم اٹھتی تھی' آج کل ہم اس کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ جہاں آمدنی میں ترقی ہوئی ہے' وہاں اخراجات میں اضافہ اس سے بھی زیادہ۔ رہن سہن کے طور طریقوں میں جو روز بروز تبدیلی آ رہی ہے' اس کا آج سے نصف صدی یا کم پہلے سوچا بھی نہ جا سکتا تھا۔ کل جو اشیاء آسائش کے زمرہ میں تھیں' آج ضرورت بن گئی ہیں۔ لیکن بعض والدین جنہوں نے حالات اور وقت کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا' اپنی بہو کے گھریلو مصارف کو انتہائی درجے کی فضول خرچی پر محمول کرتے ہیں۔

بہو کتنا ہی ہاتھ کھینچ کر خرچ کرے' ساس اسے انتہائی درجے کی فضول خرچ کا خطاب دے دیتی ہے۔ ماں کا ایسی باتیں کرنے کا اصل مقصد بیٹے کو اپنے زیر اثر رکھنا ہوتا ہے اور اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بیٹے کی آمدنی پر اس کا مکمل اختیار ہو۔ ایسے شوہر جو اپنے والدین کی ہر معاملہ میں تابعداری کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں' گھر کے تمام مصارف اپنی والدہ کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں۔ ایسے غیر اخلاقی

معاملات کا حضرت مسیح اللہؒ نے خوب جائزہ لیا ہے: ''(پہلی برائی یہ کہ) بعض شوہر اپنی بیویوں کو اخراجات کے لیے مناسب رقم نہیں دیتے' اور بعض ناانصافی اور بلا جواز مار پیٹ بھی بلاتکلف روا رکھتے ہیں۔ دوسری برائی یہ کہ تمام کی تمام آمدنی اپنے ماں باپ کے ہاتھوں میں رکھ دیتے ہیں اور بیوی ہر ضرورت کے لیے اس کے والدین کی دست نگر ہوتی ہے۔ اور وہ (والدین) اکثر اوقات اس کی ضروریات کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے اور بے اعتنائی سے ٹھکرا دیتے ہیں''۔ البتہ اخراجات کے معاملہ میں' قرآن پاک اور احادیث کی روشنی میں ایک بات کا سمجھنا اور اس پر عمل پیرا ہونا بہت لازم ہے کہ ان میں نہ تو فضول خرچی ہونی چاہیے اور نہ ہی کنجوسی (بخل) کا معاملہ ہو' بلکہ راہِ اعتدال ہو۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾ ﴾ (الفرقان) ''اور (عبادالرحمٰن وہ ہیں کہ) جو خرچ کرتے وقت نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ بخیلی بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل طریقے پر خرچ کرتے ہیں''۔ اور فرمان نبوی ﷺ ہے: ((مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ)) ''وہ محتاج نہیں ہوا جس نے میانہ روی اختیار کی''۔(۳۰)

حوالہ جات

(۱) الموسوعة الفقهية الكويتية و نسائیات از پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج' کلیہ معارف اسلامیہ' جامعہ کراچی' طبع ۲۰۱۲ء' ص ۲۷۸' بار اوّل۔

(۲) نسائیات از پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج' کلیہ معارف اسلامیہ' جامعہ کراچی' طبع ۲۰۱۲ء' ص ۲۷۸' بار اوّل۔

(۳) صحيح البخاری' كتاب الهبة' ح:٢٤٥٤۔ سنن ابی داوٗد' كتاب النكاح' ح:٢١٣٥۔ سنن ابن ماجه' كتاب النكاح' ح:١٩٧٢۔

(۴) معارف القرآن از مفتی محمد شفیعؒ' جلد دوم' پارہ۴' سورۃ النساء' آیت۴' ص ۲۹۷ تا ۲۹۹' طبع 2015ء' مکتبہ معارف القرآن' کراچی۔

(۵) رواه البيهقی فی "شعب الايمان" والدارقطنی فی "المجتبیٰ"۔ مشكاة المصابيح' كتاب البيوع' باب الغصب والعارية۔

(۶) تفسیر مظہری از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی' مترجم (متن) پیر محمد کرم شاہ الازہری' ج۲' پارہ۴' سورۃ النساء' آیت۴' ص ۲۵۴ تا ۲۵۶۔ طبع ۱۰' بار چہارم۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز' لاہور۔

(۷) تفسیر مظہری از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی' مترجم (متن) پیر محمد کرم شاہ الازہری' ج۲' پارہ۴' سورۃ النساء' آیت۴' ص ۲۵۴ تا ۲۵۶۔ طبع ۱۰' بار چہارم۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز' لاہور۔

(۸) حقوق الزوجین از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ' عنوان 'مہر'' ص ۷۵ تا ۷۷' طبع ۱۹۴۳ء' بار دوم' دارالاسلام' پٹھان کوٹ' (ضلع گورداسپور)۔

(۹) تفسیر مظہری از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی' مترجم (متن) پیر محمد کرم شاہ الازہری' ج۱' پارہ۵' سورۃ النساء' ص ۳۲۲ تا ۳۲۳۔

(۱۰) صحيح مسلم' كتاب النكاح' باب الصداق...... ح:١٤٢٦۔

(۱۱) مجموع الفتاویٰ لشیخ الاسلام ابن تیمیه ۱۹۲/۳۲۔
(۱۲) مسند احمد ۱۴۵،۸۲/۶، والبیهقی فی السنن الکبریٰ فی الصداق ۲۳۵/۷۔
(۱۳) الطبرانی فی الکبیر (۱۱۰۰۰) وابن حبان (۱۲۵۵)۔
(۱۴) صحیح ابن حبان۱۵۸/۷، سنن البیهقی ۲۳۵/۷۔
(۱۵) سنن الترمذی، کتاب النکاح، ح:۱۱۱۴۔سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، ح:۲۱۰۶۔سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، ح:۱۸۸۷۔
(۱۶) آپ کے مسائل اوران کا حل ازحضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی، ج ۵، ص عنوان 'حق مہر' ص ۱۴۸ تا ۱۵۶، طبع ۱۹۹۸ء، مکتبہ لدھیانوی، کراچی۔
(۱۷) مسند البزار ۲۵۶/۱۵۔ مجمع الزوائد للهیثمی ۱۳۴/۴۔
(۱۸) تحفۃ العروس از علامہ محمود مہدی استانبولی، مترجم مختار احمد ندوی، مکتبہ قدوسیہ لاہور، طبع ۱۹۹۱ء، باردوم۔
(۱۹) آپ کے مسائل اوران کا حل ازحضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی، ج ۵، ص ۱۴۸ تا ۱۵۵۔
(۲۰) معارف القرآن از مفتی محمد شفیع، ج ۱، پارہ ۱، سورۃ البقرۃ، آیت ۲۳۶۔ادارۃ المعارف، کراچی، طبع ۱۹۸۳ء۔
(۲۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ، ح:۱۲۱۸۔
(۲۲) سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، ح:۲۱۴۲۔
(۲۳) صحیح البخاری، کتاب النفقات، ح:۵۰۳۶، وصحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، ح:۱۶۶۹۔
(۲۴) صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، ح:۹۹۵۔
(۲۵) رواه البیهقی فی شعب الایمان و ابو نعیم فی الحلیة۔
(۲۶) حقوق الزوجین از سید ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۷۷ تا ۸۰۔ دارالاسلام، پٹھان کوٹ (ضلع گورداسپور)، طبع ۱۹۴۳، باردوم۔
(۲۷) معارف القرآن از مفتی محمد شفیعؒ، ج ۸، پارہ ۲۸، سورۃ الطلاق، آیت ۷، ص ۴۹۰ تا ۴۹۱، ادارۃ المعارف، کراچی، طبع ۱۹۹۰ء۔
(۲۸) تفسیر مظہری از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، ترجمہ متن پیر محمد کرم شاہ الازہری، ج ۱، پارہ ۲، سورۃ البقرۃ، آیت ۲۳۳، ص ۴۶۲۔
(۲۹) تفسیر مظہری از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، ترجمہ متن پیر محمد کرم شاہ الازہری، ج ۱، پارہ ۲، سورۃ البقرۃ، آیت ۲۳۳، ص ۴۶۲۔
(۳۰) The Pious Husband، تالیف مجلس علماء، جنوبی افریقہ، صالح خاوند (ترجمہ) از ادارہ علم القرآن، لاہور، طبع ۱۹۹۴ء، ص ۸۶ تا ۸۷۔

❀❀❀

کتاب نُما

تعارف وتبصرہ

نام کتاب : انگلستان میں اسلام

تالیف : ڈاکٹر صہیب حسن

پبلشرز : دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

تاریخ اشاعت: 2016ء (اشاعت اوّل)

کتاب ہذا کے مؤلف ڈاکٹر صہیب حسن صاحب سے قارئین حکمت قرآن بخوبی واقف ہوں گے، جن کی 'ملاک التاویل' (مؤلفہ ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن زبیر الغرناطی) کی تلخیص وترجمانی کی بارہویں قسط زیرنظر شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ یہ سلسلہ مضامین قرآن کی آیات میں گہرا تدبر کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لیے بہت قیمتی ہے اور مفید بھی، جو ڈاکٹر صہیب حسن کی ترجمانی اور محنت وکاوش کے نتیجے میں ازحد سلیس بن گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے جزیل سے نوازیں۔ آمین!

ڈاکٹر صاحب سے راقم السطور کا تعارف وتعلق ۱۹۶۲ء سے ہے جب وہ اسرار بھائی کی دعوت پر لائل پور (حال فیصل آباد) سے منٹگمری (حال ساہیوال) آئے اور وہاں برادر محترم کے قائم کردہ ''دارالمقامہ'' میں مقیم سات طلبہ کو عربی صرف ونحو اور دوسری ابتدائی دینی تعلیمات کے لیے مدرس مقرر کیے گئے۔ میں ۶۲ء میں کالج کے انٹرمیڈیٹ کے سال دوم اور باقی سب سال اوّل کے سٹوڈنٹ تھے۔ چونکہ صہیب صاحب مجھ سے صرف دو اڑھائی برس بڑے ہیں اس لیے ہم سب ہی نے ان سے بے تکلفی کے انداز میں سیکھا اور پڑھا۔ ہم ان کے عمر میں قدرے بڑے ہونے اور ساتھ ہی ان کے انتہائی قابل احترام والد اور جماعت اسلامی کے سابق نامور عالمِ دین مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے حوالے سے ان کی عزت وتکریم کرتے تھے۔ اس دوران ہی صہیب صاحب نے بی اے انگلش کی تیاری کر کے فیصل آباد سے امتحان دیا اور اس طرح پنجاب یونیورسٹی کے گریجویٹ بنے۔ پھر جلد ہی انہیں اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ میں داخلہ مل گیا، چنانچہ ان کی جگہ خود مولانا عبدالغفار حسن صاحب ازراہ کرم ہمارے اتالیق کی حیثیت سے ساہیوال تشریف لائے۔ شہر کی ہائی سٹریٹ پر کرائے کے مکان میں طلبہ کا ہاسٹل 'دارالمقامہ' تھا اور بالکل ملحق چھوٹے سے گھر میں مولانا فیملی کے ساتھ رہائش پذیر ہوئے۔ مولانا کی شام کی کلاسز سے استفادہ، قریب واقع مسجد نور میں نمازوں کی ادائیگی اور ہفتے میں دو تین دروس (جن میں ایک ہفتہ وار درس قرآن سیٹلائٹ ٹاؤن میں ہوتا تھا) مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مولانا نے حدیث میں 'ریاض الصالحین'

کے کچھ حصے ہمیں پڑھائے اور مختصر نوٹس بھی املا کروائے۔ گمان غالب یہ ہے کہ صہیب صاحب نے مدینہ یونیورسٹی میں والد محترم کا تعارف کروایا ہوگا جس کے باعث جامعہ اسلامیہ کے ایک سینئر فیکلٹی ممبر پاکستان آ کر مولانا عبدالغفار حسن صاحب کو استاذ الحدیث کے طور پر مدینہ منورہ لے گئے۔ چنانچہ مولانا کو وہاں پندرہ سترہ سال رہنے کا موقع ملا۔ صہیب صاحب جامعہ سے تعلیم مکمل کر کے مبعوث کی حیثیت سے سعودی حکومت کے دارالافتاء والارشاد کی ملازمت میں افریقہ کے بعض ممالک بالخصوص کینیا میں رہے۔ نیروبی ہی سے صہیب صاحب نے انگلستان کا پہلا مختصر دورہ ۱۹۷۳ء کے اوائل میں کیا۔ راقم الحروف بھی اس وقت لندن میں موجود تھا۔ طویل وقفے کے بعد ان سے مل کر از حد خوشی ہوئی تھی۔ ان کے میزبان تو اگرچہ کینیا کے ایک متموّل شخص تھے اور کچھ احباب بھی چند شہروں کی وزٹ کے دوران ساتھ رہے، لیکن لندن سے ابتدائی تعارف میں کچھ حصہ راقم کا بھی تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ صہیب صاحب کی فرمائش پر میں نے انہیں برٹش میوزیم کا تفصیلی مشاہدہ کروایا اور شہر کے بعض علمی اور ثقافتی اہمیت کے مقامات کی سیر بھی کرائی۔

اللہ تعالیٰ کا تکوینی امر دیکھئے، ڈاکٹر صہیب حسن ۱۹۷۶ء سے یعنی چار دہائیوں سے زیادہ انگلستان میں مستقل اور مسلسل اقامت پذیر ہیں، اور انہوں نے وہاں بلا مبالغہ سینکڑوں مساجد کی تعمیر اور آبادکاری میں انتہائی محنت اور جانفشانی سے کام کیا ہے۔ کتاب 'انگلستان میں اسلام' ایک اعتبار سے مسلم آبادی کی جزائر برطانیہ میں دینی و دعوتی تگ و تاز کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مساجد صرف عبادت کی جگہیں ہی نہیں ہیں بلکہ یہ تبلیغ اسلام کا مؤثر ترین ادارہ ہیں اور ساتھ ہی مسلمانوں کے میل جول اور اجتماعی دینی پروگراموں کے لیے بہترین فورم ہیں۔ سعودی عرب کے دارالافتاء سے نسبت کی وجہ سے انہیں بالخصوص ہر اُس مسجد کے پراجیکٹ کو دیکھنے کا موقع ملا جس میں مخیّر سعودی حضرات یا شاہی خاندان کے افراد نے دل کھول کر امداد دی تھی۔ حرمین شریفین کے امام حضرات خاص طور پر تشریف لا کر ان کا افتتاح کرتے رہے اور نمازوں کی امامت سے لوگوں کے دلوں کو گرمایا اور مثبت دینی جذبات کو انگیخت دی۔

بطور داعی صہیب حسن صاحب اس اعتبار سے لائق تحسین ہیں کہ ان کا تعلق انگلستان کے طویل قیام کے دوران دنیا بھر کے بیشتر مسلمان ممالک سے آئے ہوئے تارکین وطن سے رہا ہے۔ وہ چونکہ اردو، عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی مہارت رکھتے ہیں اس لیے ان کے خطاباتِ جمعہ متعدد مساجد میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور انگریزی میں بھی ہوتے رہے۔ مساجد اور اسلامک سنٹرز کے قیام و توسیع کی سالوں پر محیط تاریخی داستان کو مؤلف کتاب نے جس طرح بیان کیا ہے، اور جس تفصیل سے ان حضرات کے نام تحریر کیے ہیں جن کی انتھک کوششیں ان دینی پراجیکٹس میں شامل رہیں — قابلِ ستائش ہے۔ صہیب صاحب نے ان تمام حضرات کو کھلے دل سے دعائیں بھی خوب دی ہیں۔ خاص طور پر ارضِ برطانیہ اور آئرلینڈ کے مختلف شہروں میں انیسویں صدی کے اواخر میں اوّلین مساجد کے قیام کی تفاصیل تو بہت دلچسپ، ایمان افروز اور چشم کشا ہیں۔ جولائی ۱۹۷۶ء سے

شروع ہونے والا صہیب صاحب کا دینی و دعوتی saga زیر تبصرہ کتاب کے پونے دوصد سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔اس کا آغاز کس طرح اور کیونکر ہوا' انہی کی زبانی سنیے:

''جولائی ۱۹۷۶ء میں جب دارالافتاء سعودی عرب سے بحیثیت ایک داعی وابستگی کی بنا پر مفتی اعظم سعودی عرب شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ نے کینیا سے میرا تبادلہ لندن کیا تو میں نے اپنی صوابدید پر دعوت وتبلیغ کا آغاز کیا' جس کی ایک شکل ''القرآن سوسائٹی'' کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوئی۔لیکن ہوا یہ کہ مجھے آئے ہوئے ابھی چند ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ شیخ ابن باز کے سیکرٹری اور عم زاد شیخ عبدالعزیز بن ناصر البازبھی نجی دورے پر لندن وارد ہوئے۔ وہ بلگیریو اسکوائر میں واقع سعودی عرب کے سفارت خانے تشریف لے جارہے تھے' مجھے بھی ساتھ لے لیا۔فرسٹ سیکرٹری جناب عبداللہ بری سے ملاقات ہوئی' میرا تعارف کرایا اور بتایا کہ تازہ تازہ یہاں وارد ہوا ہوں۔عبداللہ بری نے کہا کہ یہاں ہمیں ایسے شخص کی ضرورت ہے جو یہاں کی مسلمان کمیونٹی کی ضروریات سے ہمیں آگاہ کرتا رہے' اور خاص طور پر ان تمام منصوبوں کے بارے میں ہمیں تحقیقاتی رپورٹ دیتا رہے جو مساجد اور مدارس کے قیام کے سلسلے میں سعودی عرب سے اعانت کے طالب ہوتے ہیں۔شیخ نے میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور یوں میں اس کارِخیر میں ایسا شریک ہوا کہ اب لگ بھگ چالیس سال ہو رہے ہیں' میں ہر اُس مسجد یا ادارے کو دیکھنے کے لیے خود جاتا رہا ہوں جو سعودی عرب سے مالی امداد کے خواہاں رہے ہیں۔ان میں سے اکثر وہ ہیں جنہیں میرے قلم سے نکلی چند سطور کی بنا پر سعودی سفارت خانے کی تائید وتوثیق کے بعد قابل قدر اعانت حاصل رہی ہے اور وہ بھی جو میری مثبت رپورٹ کے باوجود معمول کی کارروائیوں کے نتیجہ میں ہنوز ساحل مراد تک پہنچ نہیں پائیں۔البتہ اس بات کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر مسئلہ مسجد کی تعمیر کا ہو تو میرا قلم ہمیشہ مثبت اشارے ثبت کرتا رہا ہے اور میں نے ہمیشہ ان لوگوں کے بارے میں کلمہ خیر کہا ہے' جو اس دیارِ غیر میں قرآن وسنت کی ترجمانی کو اپنا فریضہ اوّلین بنائے رہے ہیں۔مجھے اللہ سے اُمید ہے کہ بفحوائے حدیث نبوی ((مَنْ دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ فَھُوَ کَفَاعِلِہٖ)) مجھے بھی اس کارخیر کے اجر سے محروم نہیں رکھا جائے گا۔''

ذاتی طور پر کتاب ہذا میرے لیے اس لیے بھی انتہائی دلچسپی کی ہے کہ اس نے مجھے ماضی کے دریچوں میں جھانکنے کا موقع فراہم کیا۔ان جگہوں اور مسجدوں کی یادیں اور احباب کا سراپا ذہن کے پردے پر آ گیا جن سے وسط ۱۹۷۳ء میں انگلستان سے پاکستان مراجعت کے بعد ملاقات نہ ہوسکی۔اگرچہ تین بار مختصر وزٹ پر انگلینڈ جانا ہوا لیکن ان پرانے دوستوں سے ملاقات کی سبیل نہ نکل سکی۔ان بیسیوں ناموں میں اسلامک فاؤنڈیشن کے ڈاکٹر مناظر احسن' جریدہ امپیکٹ کے ایڈیٹر حاشر فاروقی' یو کے اسلامک مشن کے رشید احمد صدیقی' تنظیم واسطی' جناب شفیق الرحمٰن' اجمل احمد صاحب' ڈاکٹر کلیم صدیقی' عزیز پاشا' ڈاکٹر سید علی اشرف' ڈاکٹر غیاث الدین اور متعدد دوسرے حضرات شامل ہیں۔ڈاکٹر کلیم صدیقی کے انتقال کو تو غالباً پندرہ بیس سال ہو چکے۔صہیب صاحب کی زبانی اجمل احمد صاحب کے سانحہ ارتحال کا معلوم کر کے دکھ ہوا۔ بھلے آدمی' ملنسار اور اسلامی جذبہ رکھنے والے متحرک شخص تھے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں اپنے خصوصی جوارِ رحمت میں جگہ دیں۔آمین!

مساجد کی تعمیر' انتظام وانصرام' خطباتِ جمعہ اور دروسِ قرآن وحدیث کی دی گئی تفصیلات سے ڈاکٹر صہیب حسن کی بالخصوص مساجد سے دلچسپی کے حوالے سے ذہن اس حدیث رسول (ﷺ) کی طرف منتقل ہوا جس میں آپؐ نے منافق اور مؤمن کے درمیان فرق کرتے ہوئے فرمایا کہ مؤمن کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جن سات طرح کے اشخاص کو اپنے عرش کے سائے کے نیچے جگہ دے گا ان میں ایک ''رَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ'' ہے اور یقیناً صہیب صاحب ان خوش قسمت حضرات میں شامل ہوں گے۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ مؤلف کا رابطہ انگلستان کے علمی حلقوں اور ریسرچ اداروں سے بھی ہے۔ انہوں نے ڈاکٹریٹ بھی دراساتِ اسلامیہ میں برمنگھم یونیورسٹی سے کی۔ متعدد ٹی وی چینلز پر ان کے اردو اور انگریزی میں خطابات جس طرح قرآن وسنت کی تعلیمات کو گزشتہ دس بارہ سال سے پیش کر رہے ہیں' میرے خیال میں انگلستان کی سیکولر اور انتہائی permissive سوسائٹی میں رہنے والی مسلمانوں کی نژادِ نو پر اچھے اثرات مرتب کر رہے ہوں گے اور خاص طور پر کالج اور یونیورسٹی طلبہ و طالبات کے Cultural Schizophrenia میں مبتلا ہونے سے رکاوٹ بن رہے ہوں گے' اور وہ اعتماد اور مثبت عزم کے ساتھ اپنے اسلامی تشخص کا اظہار کر سکتے ہوں گے۔ یہ بات انتہائی خوش آئند ہے کہ صہیب صاحب کے ساتھ ان کی اہلیہ اُمّ وہیب' صاحبزادی خولہ حسن اور بیٹوں میں سے خصوصاً ڈاکٹر اسامہ حسن بھی دعوتی سرگرمیوں میں فعال ہیں۔ خواتین کے حلقے میں اُمّ وہیب اور خولہ حسن دروسِ قرآن اور سوالات کے جوابات پروگرام 'النساء' کے حوالے سے بہت عرصے سے کتاب اللہ وسنتِ رسول کی تعلیمات دیارِ غیر میں پھیلا رہی ہیں۔ اس طرح بحمداللہ یہ گھرانا 'ایں خانہ ہمہ آفتاب است' کی عمدہ مثال ہے۔ مؤلفِ کتاب نومبر کے آخری ہفتے میں دو دن کے لیے لاہور تشریف لائے تھے۔ نئی مساجد کو دیکھنے کا جذبہ یہاں بھی کارفرما رہا۔ چنانچہ انہوں نے بحریہ ٹاؤن کی مشہور بڑی مسجد وزٹ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس طرح راقم کو بھی پہلی بار ان کے ہمراہ بحریہ ٹاؤن کی شاندار مسجد دیکھنے اور وہاں مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے کا موقع ملا۔ قبل ازیں میں نے ایک بار ملحقہ سڑک سے گزرتے ہوئے دور ہی سے دیکھا تھا۔ اذان سے قبل دس پندرہ منٹ میں صہیب صاحب نے مسجد کے اندرونی حصوں' کتابوں کے شیلف اور جملہ آرائشیں بہت غور اور دلچسپی سے دیکھیں۔ غالباً وہ اس مسجد کا دنیا بھر کی دوسری بڑی مساجد سے موازنہ کر رہے ہوں گے۔ انہیں بتایا گیا کہ بحریہ ٹاؤن کی انتظامیہ کراچی میں اس سے کئی گنا وسیع مسجد بنا رہی ہے۔

اس تعارفی تبصرے کا اختتام راقم محترم صہیب صاحب کے صاحبزادے جناب اسامہ حسن کے تذکرے پر کرے گا جو فزکس اور فلکیات میں کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کیے ہوئے ہیں۔ انہیں مساجد میں دعوتی تقاریر اور جمعہ کے خطابات کے علاوہ یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ Royal Observatory کے نوتعمیر شدہ گنبد (Dome) میں سماءِ دنیا پر چمکنے والے ستاروں اور سیارچوں کی حرکت پر مشتمل پروگرام کا شو (show) وقتاً فوقتاً پیش کرتے ہیں اور ناظرین کو ان کے عربی ناموں کی اصلیت سے آگاہ کرنے سے بھی نہیں

چوکتے۔ کتاب کے آغاز میں سولہ صفحات پر مشتمل محترم خلیل الرحمٰن چشتی صاحب کا مقدمہ بھی غیر مسلم معاشروں میں دعوت اسلام کے موضوع اور منہج پر بہت عمدہ اور پرمغز تحریر ہے۔ انہوں نے اپنے بیرونی اسفار کے وسیع تجربات کی روشنی میں مغربی دنیا میں جاہلیتِ شرق اور جاہلیتِ غرب کے دو آتشہ ملاپ کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ بہرحال عالمی سطح پر مسلمانوں کی دعوتی سرگرمیوں کو جاننے کے لیے یہ کتاب کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صہیب حسن صاحب سے مزید خدمت دین لے اور ان کی مساعی کو عالم اسلام کے لیے نافع بنائے۔ آمین!

(تبصرہ نگار: ڈاکٹر ابصار احمد)

(۲)

نام کتاب : ناموسِ رسالتؐ (اعلیٰ عدالتی فیصلہ)

مصنف : جسٹس شوکت عزیز صدیقی

مرتب : سلیم منصور خالد

ضخامت: 348 صفحات

ناشر: پوسٹ بکس 9093، علامہ اقبال ٹاؤن

ملنے کا پتہ: منشورات، منصورہ ملتان روڈ، لاہور

مارچ ۲۰۱۷ء کے آغاز میں ایک شہری نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی دفعہ ۱۹۹ کے تحت ایک درخواست دی جس میں رسول اللہ ﷺ آپؐ کے اصحاب و ازواج، کتاب اللہ اور خود اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان میں گستاخی کو موضوع بنایا گیا تھا۔ عدالتِ عدالیہ کے فاضل جج مسٹر جسٹس شوکت عزیز صدیقی نے انتہائی محنت، کمال جستجو، مؤمنانہ فراست اور ایمانی جذبہ کے ساتھ اس درخواست کی سماعت کی۔ ناموسِ رسالت کے حوالے سے گستاخِ رسول کی شرعی حیثیت اور اس کی سزا کے متعلق اُمتِ مسلمہ کے نامور مصنفین کی ۳۷ کتب سے حوالہ جات دیے، اس کے علاوہ کتب حدیث اور تفاسیر کی بہت سی کتب کے شواہد بھی درج کیے۔ قرآن مجید کی سورۃ التوبہ کی آیت ۶۱ کا ترجمہ بھی لکھا جو موضوع کی حد درجہ وضاحت کرتی ہے: ''اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لیے دردناک سزا ہے''۔ اسی طرح سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۷ کا حوالہ دیا جس میں واضح کیا گیا ہے: ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے، اور ان کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر دیا ہے''۔ اگرچہ یہ دو آیات انصاف پسند شخص کے لیے کفایت کرتی ہیں، تاہم اس مضمون کی دوسری آیات بھی اس میں موجود ہیں۔ جسٹس صاحب یاد دلاتے ہیں کہ ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی مقدس ہستی کے بارے میں آزادانہ رویہ نہ رکھیں، کیونکہ آزادیٔ رائے اور گفتگو کا حق چند شرائط کے تحت ہی جائز

ہے جن کا ذکر یہاں کر دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کی محبت ان کے ایمان کا جزو ہے' اگر یہ نہیں تو ایمان کا دعویٰ سچا نہیں۔ حدیث میں ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپؐ سے کہا کہ مجھے آپؐ ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا اپنی جان سے بھی زیادہ؟'' تو وہ خاموش ہو گئے اور ایک لمحہ توقف کے بعد عرض کیا: ''ہاں یارسول اللہ! اب آپؐ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں''۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت ایمان کا جزو لازم ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے بیٹے' باپ بلکہ دوسرے تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں''۔ اس درجہ کی محبت کا اظہار آپ ﷺ کے صحابہ نے کیا۔ وہ آپ ﷺ کے اشارے پر اپنی جان قربان کرنا سعادت سمجھتے تھے۔

کچھ حلقوں کی طرف سے مصنف کے بیان کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا' لیکن وہ لوگ سیکولر' نام نہاد ترقی پسند اور فاشسٹ ہیں۔ انہوں نے جسٹس صاحب کے خلاف برے ارادے بھی ظاہر کیے مگر انہوں نے پروانہ کی اور ناموسِ رسالت کے حوالے سے ایک مؤثر' ٹھوس شواہد پر مبنی تفصیلی فیصلہ لکھ کر صداقت اور جرأت ایمانی کا ثبوت دیا اور کہا کہ اس فیصلے پر ناراض وہ لوگ ہیں جو عقل و دانش سے محروم ہیں' ان بدبختوں کا ایجنڈا کچھ اور ہی ہے۔

ناموسِ رسالت کے حق میں کئی معروف اسلامی شخصیات کے بیان بھی فیصلے میں شامل ہیں۔ اس میں سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی وہ تقریر بھی شامل ہے جو انہوں نے ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو پارلیمنٹ میں کی' جس میں قادیانیت کی حقیقت کو بے نقاب کیا اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتے۔

درحقیقت قادیانیت رسول اللہ ﷺ کی شان میں بدترین گستاخی ہے جو سزا کی متقاضی ہے۔ جب آپ ﷺ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو مشرکین' دشمنانِ اسلام آپؐ کے سامنے تھے۔ آپ رحمۃ للعالمین تھے۔ آپؐ نے ان سب کو معاف کر دیا' مگر ان میں سے چند ایک کو آپ ﷺ کی رحمۃٌ للعالمینی سے بھی فائدہ نہ پہنچا اور اُن کے قتل کا حکم دے دیا گیا۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے گستاخ تھے اور آپؐ کی ذات کو اذیت دینے والے تھے۔

جسٹس شوکت صدیقی کا یہ فیصلہ قابلِ تحسین ہے۔ اس میں توہین رسالت پر اٹھنے والے ہر اعتراض کا جواب بھی موجود ہے۔ اس فیصلے میں ریاست کو بھی اس کی ذمہ داری سے آگاہ کیا ہے۔ مزید برآں اس فیصلے میں غیر قانونی ردعمل میں جرم کے ارتکاب کی روک تھام کی گئی ہے۔ نیز اس کے آئینی و قانونی پہلو بھی واضح کر دیے گئے ہیں۔

جہاں بے شمار اکابرین نے اس فیصلے کی تحسین کی ہے وہاں ریٹائرڈ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے نہ صرف فیصلے کو سراہا ہے بلکہ جسٹس صدیقی صاحب کو ایک ایسی عدالتی شخصیت قرار دیا ہے' جو قانون پر دسترس رکھنے کے ساتھ ناموسِ رسالت کے تحفظ کے حوالے سے اعلیٰ اقدار کے مالک ہیں۔

(تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

(۳)

نام کتاب : کاروانِ نبوّت (روح الامین کی معیت میں) حصہ چہارم

مؤلف : پروفیسر ڈاکٹر تسنیم احمد

ضخامت: 288 صفحات قیمت: 350 پاکستانی روپے/15 امریکی ڈالر

ملنے کے پتے : (۱) البدر 23 راحت مارکیٹ' اردو بازار' لاہور

(۲) اسلامک ریسرچ اکیڈمی D-15 فیڈرل بی ایریا بلاک 5 کراچی

اس کتاب کی قبل ازیں تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔ یہ چوتھی جلد ہے جو نبوت کے پانچویں سال کے نصف آخر اور چھٹے سال کے واقعات و معاملات کی تفصیل پر مشتمل ہے اور یہاں اس دوران نازل ہونے والے قرآن کے اجزاء بھی بیان کر دیے گئے ہیں۔ پہلی تین جلدوں میں نبوت کے ابتدائی چار سالوں اور پانچویں سال کے نصف اول تک کے احوال و واقعات ہیں اور انہیں نازل ہونے والی آیات کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا ہے۔

مصنف نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی سیرت' نزولِ قرآن کی ترتیب اور کاروانِ نبوت کی تاریخ قلمبند کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مصنف کی گہری محبت عیاں ہے۔ کتاب میں واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحقیق کے مسلمہ اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جہاں مشہور بات سے اختلاف کیا گیا ہے وہاں مصادر کا حوالہ دے کر اپنے موقف کو واضح کیا گیا ہے' مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام کا واقعہ۔

باب 63 کا عنوان ہے: ''دورِ نبوت کی تقویم''۔ اس کے تحت قمری' شمسی' ہجری' جولین' گریگورین وغیرہ کیلنڈروں کا ذکر کیا گیا ہے جو انتہائی باریک حقائق پر مشتمل ہے۔ قرآن کی نزولی ترتیب کے تحت سیرت النبی ﷺ کے واقعات کی تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ ایک گراں قدر ماخذ ہے۔

یہ کتاب عمدہ سفید کاغذ' معیاری طباعت' پیپر بیک بائنڈنگ اور جاذبِ نظر گیٹ اَپ کے ساتھ ظاہری و باطنی خوبصورتی کی حامل ہے۔

(تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-Ma'idah

(The Repast / The table laden with food)

(Recap of verses 51 – 66 of Surah Al-Ma'idah and fresh exposition of verses 67 – 86 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap of verses 51 – 66 of Surah 5, Al-Ma'idah

The reader would recall that we had concluded our exposition of verses 51 – 66 of Surah Al-Ma'idah in the previous issue of Hikmat e Qur'an. A brief recap of the exposition follows:

1- Verse 51 defines the foreign policy of a genuine Islamic state, viz. Jews and Christians. Allah (SWT) prohibits the Muslims to take the Jews and the Christians as their friends, long-term allies and protectors, because they are only friends and protectors to one another against Islam and have a strong enmity against the Muslims; hence the stern warning to Muslims who join them or act as their agents. We also saw the applicability of the verse in present times, particularly regarding the unholy alliance between Zionist Jews and Christians against Islam.

2- Verse 52 deals with both "sceptical" people (ones following a policy of wait and see) as well as "genuine" hypocrites (following a policy to damage Islam at any cost) and unveils the respective positions that were concealed in their heart and the secret relations they seek to maintain with the non-Muslims.

3- Verse 53 declares that no matter how much the "genuine" hypocrites profess to follow Islam – by performing Prayers, by observing Fasts, by paying Zakah, by taking part in wars (Qit'al) – all was reduced to naught because they had not devoted themselves to the service of the One True Allah (SWT).

4- Verse 54 states that a true Muslim ought to be both 'humble towards fellow believers' and 'firm towards unbelievers', simultaneously. The native intelligence, shrewdness, ability, influence, wealth, physical prowess of a true Muslim should not be used for the purpose of either suppressing, persecuting or causing harm to other Muslims. However, in following the religion of Allah (SWT), in implementing His (SWT) injunctions, in judging things to be either right or wrong according to the criteria of the faith, the believer ought to be

afraid of nothing. He will be impervious to opposition, reproach, denunciation, name-calling and scorn, even when public opinion happens to be hostile, and his efforts to follow Islam single him out for the scorn of the whole world, the man of faith will still follow the way which he recognizes in his heart to be true.

5- Verses 55 and 56 state that the hypocrites take their friends from the disbelievers or others from the Jews and the Christians instead of the believers but the real protecting friends are Allah (SWT), His Messenger (SAAW) and the faithful believers. Moreover, verse 56 also directs the attention of the believers that they must be patient in their desire for victory.

6- Verse 57 ordains Muslims to refrain from considering such unbelievers and People of the Book (Jews and Christians) as allies who try to make fun of Islam in any form or manner. This verse is as relevant for the Muslims of today as it was for those living 14 centuries ago. Verse 58 has a message similar to the one given in verse 57, albeit more specific to an Islamic ritual – "The Call to Prayer" (Adhan). The verse declares that the unbelievers ridicule Adhan due to their ignorance and foolishness, along with wicked nature.

7- Verse 59 directly questions the ethical and moral premise of unbelievers. In this verse, Allah (SWT) commands His Messenger (SAAW) to ask, rather take to task, those who make fun of Islam and its followers by ridiculing the Islamic teachings and mock Muslims just because they believe in One True Allah (SWT). In the verse, Allah (SWT) also commands His Messenger (SAAW) to rebuke them for their despicable attitude towards the Holy Qur'an and all the divine scriptures revealed before it.

8- The allegory used in verse 60 alludes to the Jews whose history shows that they were subjected, over and over again, to the wrath and scourge of Allah (SWT). When they desecrated the law of the Sabbath (found in the Torah) the faces of many of them were distorted, and subsequently their

degeneration reached such a low point that they took to worshipping Satan quite openly. The purpose of saying all this is to draw attention to their criminal boldness while they had sunk to the lowest level of evil, transgression and moral decadence, they vigorously opposed all those who lived a truly pious and righteous life.

9- Verse 61 explains that the hypocrites proclaim their faith and pretend to be Muslims when they are in Prophet's (SAAW) presence or with the Muslims. But Allah (SWT) informs His Prophet (SAAW) about the disbelief and hypocrisy that the hypocrites conceal in their hearts, so much so, that He (SWT) dismisses them by stating that they came with disbelief and they went out in the same condition.

10- Verse 62 provides further examples of the crimes and sins committed by the Jews. Allah (SWT) does not mince words and clearly decrees that their actions are plain and simple 'Evil'.

11- Verse 63 brings to the fore one of the main reasons behind the degeneration of societies and states, stating that such events occur when the scholars and those in authority of furnishing as well as executing justice do not enjoin good or forbid people from committing sinful things. Although the verse uses the case of Jews to explain the phenomenon, it is equally applicable to Christians and Muslims.

12- Verse 64 takes the Jews to task for making blasphemous comments about Allah (SWT). This attitude, however, is not confined to the Jews. When confronted with trials and tribulations foolish people of other nations, too, are prone to utter such blasphemies rather than turn to Allah (SWT) with humble prayer and supplication.

13- Verse 65 declares that had the Jews sincerely believed in Allah (SWT) and followed His Messengers (AS), including the Final Messenger (SAAW), then surely He (SWT) would have forgiven their sins and admitted them to Paradise. The handful of Jews who did choose to follow this alternative path,

in fact, did receive glad tiding of Paradise in the Hereafter.

14- Verse 66 declares that if the People of the Book had established the laws revealed to their Prophets (AS) and believed in the Qur'an, then surely Allah (SWT) would have blessed them with provisions descending from the sky as well as from those grown in the earth. Moreover, it affirms that a vast majority of them did nothing but evil.

==========

Exposition of verses 67 to 86 of Surah Al-Ma'idah

Verse 67

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

"O Messenger! Deliver what has been revealed to you from your Lord, for if you (hypothetically speaking) do not, then you have not fulfilled the task of His Messengership. Allah will certainly protect you from (the evil of) men. Surely Allah guides not the unbelievers (to succeed against you)."

In this verse, Allah (SWT) commands His Messenger (SAAW) to convey His (SWT) message to mankind and thus fulfil his (SAAW) mission. The verse also states (hypothetically) that if the Prophet (SAAW) did not deliver the message revealed to him (SAAW) then he (SAAW) would not have done justice to his (SAAW) mission of conveying Allah's (SWT) message. In order to elucidate the point further, a reference to the Farewell Hajj of the Prophet (SAAW) can be made, when he (SAAW) asked his Companions (RA) at the completion of his (SAAW) sermon, "did I convey Allah's (SWT) message". The Companions (RA) unanimously replied, "We bear witness that you have conveyed the message and fulfilled your mission". He (SAAW) then raised his finger towards the sky and said, "O' Allah! Be witness". He repeated it thrice.

In the verse, Allah (SWT) also tells His Messenger (SAAW) not to fear any harm from the "evil of men", for He (SWT) will support him and

protect him from his enemies. It is reported that on revelation of this verse, the Prophet (SAAW) immediately directed the Companions (RA), who had volunteered to stand guard at his (SAAW) residence for his (SAAW) protection at night, to leave their stations and return to their homes.

The verse ends with the ordinance that the Prophet's (SAAW) duty is only to convey the message and it is Allah (SWT) who guides (to the straight path) whom He (SWT) Wills and He (SWT) has decreed that He (SWT) will not guide (to the straight path) those who disbelieve continuously (with hearts full of evil).

Verse 68

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۶۸

"Say: 'O People of the Book! You have no solid ground to stand on unless you establish the Torah and the Gospel and all that had been revealed to you from your Lord. Indeed the message revealed to you from your Lord will aggravate insurgence and unbelief in many of them. So do not grieve for those who disbelieve."

The phrase 'establishing the Torah and the Gospel' means observing them honestly and making them the law of life.

It should be noted here that the Scriptures which comprise the Bible consist of two kinds of writings. One was composed by the Jewish and Christian authors themselves. The second consists of those portions which have been recorded as either the injunctions of Allah (SWT) or as the utterances of Moses, Jesus and other Prophets (AS). The second kind of portions are clearly distinct from the first kind, due to the use of phrases such as 'The Lord said so and so', or 'A particular Prophet said so and so' in the dictum. If we were to exclude the portions belonging to the first category and carefully study those belonging to the second we would notice that their teachings are not perceptibly different from those of the Qur'an. It is true that even the second category has been tampered by translators, scribes and exegetes, and the errors of oral transmitters. Nevertheless, one cannot

help noticing that the teachings embodied in the second category call man to the same pure monotheism as the Qur'an, that they promote those beliefs propounded by the Qur'an and that they direct man to a very similar way of life as that to which the Qur'an seeks to direct him. Hence, had the Jews and the Christians adhered to the teaching attributed in their Scriptures to Allah (SWT) and the Prophets (AS), they would certainly have become a truth-loving and truth-oriented group of people and would have been able to see in the Qur'an that very light which illuminates the earlier divine Scriptures. There would then have been no question of their abandoning their religion in order to follow Prophet Muhammad (SAAW). To follow him (SAAW) would have caused neither break nor discontinuity; they would simply have gone one stage further along the same road.

Instead of reflecting on this seriously and dispassionately, they were seized by a fit of intransigence which intensified their opposition towards the Qur'an and the Holy Prophet (SAAW).

This verse warns the People of the Book that they cannot attain salvation unless they adhere to the laws revealed to them by Allah (SWT) and believe in that which He (SWT) has sent to His (SWT) last Prophet (SAAW).

The verse also emphasizes that the Holy Prophet (SAAW) ought not to grieve about those who reject faith for they will certainly be punished for their disbelief.

Verse 69

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

"(Know well, none has an exclusive claim to the Truth.) For all those who believe in Allah (and in His Messengers and all that was revealed to them) and in the Last Day and do good deeds - be they either believers, Jews, Sabaeans or Christians - neither fear shall fall upon them, nor shall they have any reason to grieve."

The context of the verse makes it clear that it is not attempting to enumerate in detail all the articles of faith in which one should believe,

or all the principles of conduct which one should follow in order to merit reward from Allah (SWT). These matters are mentioned elsewhere, in their appropriate places. The aim of the verse is merely to repudiate the illusion cherished by the Jews that, by virtue of their being Jews, they have a monopoly of salvation. They had long entertained the notion that a special and exclusive relationship existed between them and Allah (SWT). They thought, therefore, that all who belonged to their group were predestined to salvation regardless of their beliefs and actions, whereas all non-Jews were predestined to serve as fodder for hell-fire.

To clarify this misgiving the Jews are told in this verse that what really matters in the sight of Allah (SWT) is true faith and good deeds rather than formal affiliation with a certain religious community. Whoever has true faith and good deeds to his credit is bound to receive his reward, since Allah (SWT) will judge people on the basis of merit rather than on the grounds that a man's name happens to be listed in the world as a member of one religious community or the other.

Verse 70

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝

"Verily We took a covenant from the Children of Israel and sent to them many Messengers. But whenever any Messenger brought to them something that did not suit their desires, they gave the lie to some of them and killed the others,"

Allah (SWT) reminds the Jews of their covenant that He (SWT) took from them at Mount Sinai that they will obey Him (SWT) and His Messengers (AS) and associate none other with Him (SWT). But instead they followed their desires and whenever Allah (SWT) sent them His Messengers (AS) with guidance and truth, they either called them imposters or killed them *(we seek Allah's (SWT) refuge from doing such evil actions)*.

Verse 71

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

"And thinking that no harm *(Fitnah)* would come from it. Thus they became blind and deaf (to the Truth). Thereafter Allah turned towards them in gracious forgiveness; but many of them became even more deaf and blind (to the Truth). Allah sees all that they do."

In continuation to the previous verse, it is stated here that those who mocked at Allah's Messengers (AS) and killed them, thought that no affliction from Allah (SWT) would follow and they will never be punished or put to trial for their crimes. So they became blind from the truth and turned a deaf ear to Allah's (SWT) message. Even after that Allah (SWT) turned to them in mercy and forgave them but they still persisted in their disbelief and many of them again turned blind and deaf. The verse points out that Allah (SWT) observes all their actions and He (SWT) is Ever Watching over what they do.

Verse 72

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

"And surely they disbelieved who said: 'Christ, the son of Mary, is indeed God'; whereas Christ had said: Children of Israel! Serve Allah, Who is your Lord and my Lord. Allah has forbidden Paradise to those who associate anything with Him in His divinity and their refuge shall be the Fire. No one will (be able to) help such wrong-doers."

Allah (SWT) criticizes the Christians for their claim that Jesus is God incarnate. They believe that Jesus (AS) claimed divinity for himself but Allah (SWT) rebukes them and says that Jesus (AS) never uttered such words, instead he commanded the Children of Israel to worship Allah (SWT) alone, besides whom none stands worthy of worship.

The verse indicates that associating partners with Allah (SWT) is the worst crime a person can commit and it deserves the severest of punishments. Thus Allah (SWT) has forbidden Paradise for such people and has decreed Hellfire as their eternal abode, and there will be no helper or protector for such wrongdoers.

Verse 73

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾

"Certainly, they have disbelieved who say: 'Allah is one of the Three', for there is no god save the One God. And if they do not give up this claim, all who have disbelieved among them shall be subjected to painful chastisement."

In this verse, Allah (SWT) again rebukes the Christians for their false belief of Trinity and commands them to refrain from uttering such words and worship Him (SWT) alone without attributing any partners or sons to Him (SWT), and believe in Jesus (AS) only as His (SWT) Messenger (AS) and His (SWT) servant. The verse decrees that if they persist in their disbelief and polytheism (shirk) then a painful punishment awaits them in the Hereafter.

Verse 74

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٤﴾

"Will they not, then, turn to Allah in repentance, and ask for His forgiveness? Allah is All-Forgiving, All-Compassionate."

Although the Christians had committed such grave sins and persisted in their polytheism (shirk), yet Allah (SWT), in His (SWT) mercy, calls them to repent for their sins and from associating partners to Him (SWT), so that He (SWT) forgives them. The verse provides evidence that Allah (SWT) forgives those who repent and mend their ways. He (SWT) is Forgiving, Merciful.

Verse 75

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٧٥﴾

"The Messiah, son of Mary, was no more than a Messenger before whom many Messengers have passed away; and his mother adhered wholly to truthfulness, and they both ate food (as other mortals do). See how We make Our signs clear to them; and see where they turned away!"

In these few words the Christian doctrine of the divinity of Christ is repudiated, yet again. The nature of the Messiah is clear from the

indications given here; he was merely a human being. He was one born from the womb of a woman, who had a known genealogy, who possessed a physical body, who was subject to all the limitations of a human being and who had all the attributes characteristic of human beings. He slept, ate, felt the discomfort of heat and cold and was so human that he was even put to the test by Satan. How could any reasonable person believe that such a being was either God or a partner or associate of God in His godhead? But the Christians continue to insist on the divinity of the Messiah, whose life has been portrayed in their own Scriptures as that of a human. The fact of the matter is that they do not believe at all in the historical Messiah. They have woven a Messiah out of their imagination and have deified that imaginary being.

The true status of Jesus (AS) in Islam is that he is one of the honourable Messengers of Allah (SWT) just like all other Prophets and Messengers (AS) that came before him, thus refuting the false beliefs of the Christians that he (AS) claimed divinity himself (AS).

The verse also sheds some light on the person of Marriyum (AS), the mother of Jesus (AS), and says that she (AS) was a very pious and virtuous woman and contrary to the beliefs of the Christians she never claimed divinity for herself or her son Jesus (AS). In fact both of them (AS) were mere mortals and human beings and like the rest of Allah's (SWT) creation they were also subject to necessities and needed food to live, whereas Allah (SWT) does not eat.

The verse culminates by establishing that while Allah (SWT) has made His (SWT) revelations clear to them by using the simplest yet irrefutable of logics, the Christians still choose to ignore the truth due to issues of ego.

Verse 76

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

"Say: 'Do you serve (worship), beside Allah, that which has no power either to harm or benefit you, whereas Allah alone is All-Hearing, All-Knowing?'"

Allah (SWT) commands His Prophet (SAAW) to ask those who worship other deities besides Him (SWT) that how can their minds be

so perverted that they worship those who cannot prevent any harm from them nor can they benefit them in any manner?

The underlying message of the verse is that only Allah (SWT) ought to be worshipped and it is only He (SWT) who has the authority and power to protect His (SWT) creation and bring them benefit. He (SWT) sees all His servants and He (SWT) hears all what they say.

Verse 77

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ۝

"Say: 'People of the Book! Do not go beyond bounds in your religion other than the truth, and do not follow the caprices of the people who fell into error before, and caused others to go astray, and strayed far away from the right path."

Allah (SWT) commands His Messenger (SAAW) to tell the Jews and the Christians not to transgress the bounds set by Him (SWT) and not to exaggerate in religion [e.g. Allah (SWT) sent Jesus (AS) as His Messenger but the Christians exaggerated his status and gave him the rank of God]. It also warns them not to follow the evil ways and misguidance of those who lived before them. Many a nation that lived before the Jews and the Christians misled others and they themselves were strayed from the straight path.

The verse also refers to the misguided nations from whom the Christians derived their false beliefs and ways, particularly to the Hellenistic philosophers under the spell of whose ideas the Christians had veered from the straight way they had originally followed. The beliefs of the early followers of the Messiah (AS) were mainly in conformity with the reality they had witnessed, and conformed to the teachings they had received from their guide and mentor. But they later resorted to an exaggerated veneration of Jesus (AS), and interpreted their own beliefs in the light of the philosophical doctrines and superstitious ideas of the neighbouring nations. Thus they invented an altogether new religion not even remotely related to the original teachings of the Messiah (AS).

In an article in Encyclopaedia Britannica (xiv edition), under the title 'Christianity', the Reverend George William Knox writes as follows about the fundamental beliefs of the Church:

> "Its moulds of thought are those of Greek philosophy, and into these were run the Jewish teachings. We have thus a peculiar combination - the religious doctrines of the Bible, as culminating in the person of Jesus, run through the forms of an alien philosophy.
>
> In terms of the Doctrine of the Trinity, the Jewish sources furnished the terms Father, Son and Spirit. Jesus seldom employed the last term and Paul's use of it is not altogether clear. Already in Jewish literature it had been all but personified (Cf. the Wisdom of Solomon). Thus the material is Jewish, though already doubtless modified by Greek influence: but the problem is Greek; it is not primarily ethical nor even religious, but it is metaphysical. What is the ontological relationship between these three factors? The answer of the Church is given in the Nicene formula, which is characteristically Greek . . ."
>
> *[**Ref**: Encyclopaedia Britannica (xiv edition)]*

It is thus evident that it was exaggerated love and veneration of Christ (AS) which led the early Christians astray. This exaggeration and the use of expressions such as 'Lord' and 'Son of God' led to Jesus (AS) being invested with divine attributes and to the peculiar Christian notion of redemption, even though these could not be accommodated into the body of the primary teachings of Christ (AS). When the Christians came to be infected with philosophical doctrines, they did not abandon the original error into which they had fallen, but tried to accommodate the errors of their predecessors through apologetics and rational explanations. Thus, instead of returning to the true teachings of Christ (AS), they used logic and philosophy to fabricate one false doctrine after another. It is to this "fundamental" error that the Qur'an calls the Christians' attention in the verse.

Verse 78

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

"Those of the Children of Israel who took to unbelief have been cursed by the tongue of David and Jesus, son of Mary, for they rebelled and exceeded the bounds of right."

Both the Psalms of David (AS) and the Gospel (Injeel) given to Jesus (AS) contain passages and statements made by these noble Prophets (AS) cursing the Children of Israel for their transgressions.

The Psalms of David (AS) contain a verse which tells about the wickedness of the Jews as follows:

> "The sinner speaketh what will condemn him, and there is no fear of God before his eyes."
>
> *[**Ref**: Psalms of David, 10]*

Likewise the Gospel of Matthew contains the following verse, condemning the Jews:

> "Ye serpents, ye generation of vipers, how can ye escape the damnation of hell?"
>
> *[**Ref**: Gospel of Matthew (KJV), 23:33]*

They were cursed because they disobeyed Allah's (SWT) commandments and transgressed against His (SWT) creation.

Verse 79

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾

"They did not forbid each other from committing the abominable deeds they committed. Indeed what they did was evil."

This verse picks up from where the previous verse was concluded and identifies that one of the reasons for the downfall of a society is that they do not enjoin good and forbid one another from committing evil deeds. The same applies to the Children of Israel; they in their time did not forbid each other from the wickedness they did and indeed it was evil what they used to commit.

The corruption of any nation begins with that of a few individuals. If the collective conscience of that nation is alive, the pressure of public opinion keeps those persons in check and prevents the nation as a whole from becoming corrupted. But if instead of censuring such individuals, the nation leaves them free to behave corruptly, the

corruption originally confined to a few continues to spread till it engulfs the whole nation. It was this ill of the nation as a whole that ultimately caused the degeneration of the Children of Israel.

Verse 80

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

"You (can) see many of them taking the unbelievers (instead of the believers) for their allies. Indeed they have sent forward evil for themselves. (For that reason) Allah is angry with them, and they shall abide in chastisement."

In this verse, Allah (SWT) curses the Jews for taking the disbelievers (of Arabia) as their friends and protectors. The Jews of Madinah had so much hatred against Prophet Muhammad (SAAW) that they made friendships and alliances even with the pagan Arabs and considered them better than the Muslims. But Allah (SWT) says that they have only sent forth for themselves their evil deeds in the Hereafter and for that reason they have incurred His (SWT) wrath and punishment, which they will suffer forever.

Verse 81

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾

"And, had they truly believed in Allah and the Messenger and what was sent down to him, they would not have taken unbelievers (instead of believers) for their allies. But many of them have disobeyed Allah altogether."

It seems logical that those who believe in Allah (SWT), the Prophets (AS) and the Scriptures, compared with the polytheists, would naturally be more sympathetic to those who at least share with them belief in Allah (SWT), in Prophethood and in revelation (whatever their disagreements on other religious issues may be). It was ironic, therefore, that the Jews should openly support the polytheists in the struggle between polytheism and monotheism, and that their sympathies in the conflict between those who rejected Prophethood and those who believed in it should lie expressly with the former.

Despite all this, they brazenly claimed to be true believers in Allah (SWT), in the Prophets (AS) and in the Scriptures.

The verse goes on to declare that had the Jews believed in Allah (SWT), His Messenger (SAAW) and what was revealed to him i.e. the Qur'an, then surely they would never have sided with the disbelievers and made them their friends, allies and protectors instead of the believers. Allah (SWT) proclaims that most of them disobeyed and became evildoers.

---

*(**Translator's note**: Most commentators agree that verses 82 through 85 were revealed concerning the delegation that Negus (An-Najashi) of Ethiopia sent to Prophet Muhammad (SAAW). They were the followers of the teachings of Jesus (AS) and when they came to the Prophet (SAAW) and heard the Qur'an, they wept and felt humbled, immediately embracing Islam. Allah (SWT) knows Best.)*

Verse 82

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

"Of all men (in times to come) you will find the Jews and those who associate others with Allah in His divinity to be the most hostile to those who believe; and (in times to come) you will surely find that of all the people, those who say: 'We are Christians', are closest to feeling affection for those who believe. This is because there are worshipful priests and monks among them, and because they are not arrogant."

The Jews and the Pagan Arabs were the worst enemies of Islam. This is because the Jews knew that what Prophet Muhammad (SAAW) brought (i.e. The Qur'an) was the truth but they in their arrogance and defiance rejected his (SAAW) message and rebelled against the commandments of Allah (SWT). Even today we see that the imposter state of Israel is the worst enemy of Islam and has even made ties with the Pagan Hindus of India against the Muslims.

Secondly, the verse does not refer as "Christians" to those who merely say that "we are Christians", but to those who sincerely follow the

true teachings of Prophet Jesus (AS) and the Gospel (Injeel). The verse further says that the reason for the affection in the heart of real Christians for Muslims is because amongst them are those who are monks and priests who worship their Lord and they are not arrogant.

Verse 83

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨٣﴾

"And when they hear what has been revealed to the Messenger you see that their eyes overflow with tears because of the Truth that they recognize and they say: 'Our Lord! We do believe; write us down, therefore, with those who bear witness (to the Truth)."

When the delegation from Ethiopia came to the Prophet (SAAW) and heard the Qur'an, they cried and were humbled, as they recognized the truth of the Prophet-hood of Muhammad (SAAW), whose advent was already prophesized in their Scriptures. Thus they embraced Islam and prayed to Allah (SWT) to count them among the witnesses of the truth.

Verse 84

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ﴿٨٤﴾

"And why should we not believe in Allah and the Truth which has come down to us and we do fervently desire that our Lord include us among the righteous?"

The verse enunciates the other supplication that they made to Allah (SWT). The verse depicts the way in which they humbled themselves in His (SWT) obedience, made themselves ready to embrace the truth and submitted earnestly before Allah (SWT) their utmost desire to be included among the righteous.

Verse 85

فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٨٥﴾

"So Allah rewarded them for these words with Gardens beneath which rivers flow so that they would abide there for ever. Such is the reward of the people who do good."

This verse articulates the way in which Allah (SWT) answered to their supplications, mentioned in the previous two verses. Allah (SWT) rewarded them for their obedience and recognizing the truth by admitting them (decreeing to admit them) in Paradise, which will be their eternal abode.

In a nutshell, the verse explains that those who devote their lives for Allah's (SWT) religion and worship Him (SWT) alone with sincerity and devotion become eligible for His (SWT) everlasting pleasure as recompense.

Verse 86

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿٨٦﴾

"And those who disbelieved and gave the lie to Our signs are rightfully the inmates of the Blazing Flame (Hellfire)."

This verse provides a mirror image of the previous one. Unlike the faithful believers, the disbelievers and those who deny Allah's (SWT) revelations would be the inmates of the Hellfire and they will remain in it, suffering indescribable torment, eternally.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

Quarterly HIKMAT-E-QURAN Lahore
Jan - Mar 2018 Vol.37 No.1

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ——— اور ——— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ——— اور ——— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ